

**PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY**

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222054

UNIVERSAL
LIBRARY

۱۰۴

ڈاکٹر ابندر نامہ ٹیگور کا عجیب و غریب شاہکار

دُنیا ایک کہانی ہے

دیگر افسانے

شانتی ٹرائن پوری شاو کنجاہی

پبلشرز

بھارت پبلسٹک بھندرا بازار

گھنٹہ گھر کٹر آہلو و الیہ امرتسر

۱۹۶۵

۱۹۶۵

۱۹۶۵

اپنے بے چین جذبات افسانوں
کی شکل میں گیانی بلدیہ سنگھ جی
پنجابی کی سیوا میں پیش کرتا ہوں

شاد

دنیا ایک کہانی ہے

ذرا اُس بلیٹے کو دیکھ موبچوں کے مقیظروں میں
خلاصہ کر کے گویا زندگی کی داستان لکھ دی

ہم تینوں لڑکپن کے ہم راز دوست جس کمرے میں شب باشر
ہوا کرتے تھے۔ اس کے ملحقہ کمرے کے ایک کونے میں انسان کی
ہڈیوں کا مکس پنجر رکھا ہوا تھا۔ رات کو کھڑکی کے راستے آئے ہوئے
تندہ ہوا کے جھونکوں سے ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ ہمارے کمرے میں
سجھنی سنائی دیتی تھی۔ ہم ان دونوں پنڈت جی سے موسم بہار کی
شاعری اور کیں اسکول کے ایک طالب علم سے علم فریالوجی پڑھتے تھے۔
ہمارے والدین کی آرزو تھی کہ ہم جلد ہی ہی ان علموں میں کامل ہوجائیں
ان کی یہ حسرت کہاں تک پوری ہو سکی۔ یہ بات ان اصحاب کو جو ہم سے
آشنا ہیں بنانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور جو ہم سے معض

نا آشنا ہیں۔ وہ اصل حقیقت سے ناواقف ہی نہیں۔ تو یہ ہو ہو گا۔
 آج اس بات کو کافی زمانہ گزر گیا ہے۔ بہت کوشش کرنا
 پر بھی اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کہ اس مکان
 سے وہ بڈیوں کا پنجر اور ہمارے فہم سے علم فریالوجی کہاں جدا
 گیا

تھوڑے دن ہوئے۔ ایک دفعہ رات کو کسی وجہ سے جگہ نہ
 سنے پر مجھے اسی کمرہ میں رات گزارنی پڑی۔ نئی جگہ ہونے
 کی وجہ سے اس کمرے میں نیند نہ آئی۔ نامعلوم نیند کی پیر
 اس رات کہاں چلی گئیں تھیں۔ پہلو بدلتے بدلتے گر جانے
 سب بڑے بڑے گھنٹے۔ نو۔ دس۔ گیارہ۔ بارہ۔ بجادیئے
 کمرے کے کونے میں جو چراغ روشن تھا۔ وہ بھی پانچ
 سات منٹ جھلکا کر گل ہو گیا۔ اس کے پہلے اس مکان
 میں دو ایک انوس ناک اموات وقوع پذیر ہو چکی تھیں اس
 وقت جبکہ روشنی ختم ہو گئی تھی۔ کمرے میں کامن خاموشی اور
 ظلمت نے تسلط جمایا تھا۔ ان اموات کا نقشہ میری آنکھوں
 کے سامنے سینما کی متحرک تصاویر کی طرح آنے لگا۔ میں نے خیال
 کیا کہ جیسے یہ شمع دان آدھی رات کے وقت گل ہو گیا ہے۔ اسی
 طرح کبھی رات کو اور کبھی دن کو زندگی کی شمع بھی گل ہو جاتی ہے۔

قدرت کے نزدیک دونوں صورتیں یکساں ہیں ۔
 یکا یک اُس پنجر کا خیال فہم میں شعلہ زن ہوا ۔ اُس محروم
 زندگی کا زمانہ یاد کرتے ہوئے مجھے جلدی ہی معلوم ہوا کہ
 کوئی زندہ چیز اندھیرے میں کمرے کی دیوار کو ٹوٹتی ہوئی
 مسہری کے گرد چکر کاٹ رہی ہے ۔ اس کی چلتی ہوئی تیز
 سانس کی آواز بھی میرے کانوں میں پہنچی ۔ مجھے ایسا معلوم
 ہوا جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہی ہے ۔ پھر خیال کیا کہ نہیں
 یہ تمام میرے بے آرام دماغ کی اختراع ہے ۔

جس میں متواتر کئی گھنٹوں تک نیند کی ایک جہلک تک بھی
 نہیں آئی ۔ مجھے یہ بھی خیال ہوا کہ میرے دماغ میں جو دوران
 خون اس وقت ہے ۔ اُس کی حرکت کسی دوسرے کے چاروں طرف
 گھومنے کا وہم پیدا کر رہی ہے ۔ میں ذی حوصلہ تھا ۔ لیکن
 پھر بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ اس بے وجہ دہشت کو دور
 کرنے کے لئے میں نے یونہی ذرا ہلکی سی آواز میں کہا ۔

کون ہے ؟

میں ہوں

کسی نے جواب دیا ۔

میرا وہ بٹیلوں کا پنجر کہاں گیا ؟ ۔ اسی کو تلاش کرنے آئی

ہوں!

کسی نے دوبارہ سکوت کو توڑنے ہوئے کہا۔
میں نے سوچا اپنے ان ہوائی خیالوں سے ڈرنے کی چنداں
ضرورت نہیں۔ ٹیکے کو چھاتی کے نیچے رکھ کر بہت دیرینہ واقف کار
کی طرح میں نے نہایت ہی شیریں آواز میں کہا۔ "اس ادھی رات
کو خوب ٹام سوچا ہے۔ لیکن اب نہیں اُس بچھرائی کیا ضرورت ہے؟"
اندھیرے میں مسہری کے پاس ہی جواب ملا۔ کیسا سوال کرتے ہو۔
میرے دل کی ٹہیلوں اسی میں تھکیں۔ میری پچیس سال کی جوانی اسی کے
چاروں طرف منڈلایا کرتی تھی۔ ایسی اچھی اور اپنی چیز کو دیکھنے
کی حسرت ہونا کوئی حیرانی کی بات نہیں۔

میں نے کہا بات تو معقول ہے۔ اچھا تم جا کر اُس کا پتہ
لگاؤ۔ اور مجھے سولینے دو۔ وہ بولی "معلوم ہوتا ہے۔ تم
اکیلے ہو۔ اچھا تو ذرا بیٹھ جاؤ۔ آؤ کچھ بات چیت کریں۔
پنیس سال پہلے میں بھی انسان کے پاس بیٹھ کر انسانی جامے
میں بات چیت کیا کرتی تھی۔ یہ پنیس سال صرف قبرستان کی گلی
میں پرواز کرتے گذر گئے ہیں۔

آج پھر تمہارے پاس بیٹھ کر انسان کی طرح باتیں
کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس کے بعد مجھے ایسا احساس ہوا جیسے میرے پاؤں کے پاس مسہری کے اوپر کوئی بیٹھ گیا ہے۔ اور کوئی طریقہ نہ دیکھ کر میں نے کچھ زیادہ حوصلہ دکھا کر کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ کوئی دلچسپ واقعہ بیان کرو“۔

”دلچسپ“ اُس نے حیرانگی کی آواز میں پوچھا۔ تو کیا میسری زندگی کے حالات سے زیادہ دلچسپ کوئی دوسرا افسانہ ہو سکتا ہے۔ کیا میں اُسے سناؤں گا

گر جاباکی گھڑی نے ٹن ٹن کر کے دو بجائے۔ میں نے زبان بند رکھنی ہی مناسب سمجھی۔ اُس نے میری خاموشی کو رضا مندی سمجھتے ہوئے کہا۔

جب میں لسانی جانے میں تھی اور مشکل سے اپنی زندگی کی آٹھ یا نو منزلیں طے کر چکی تھی۔ اُس وقت میں ایک آدمی سے ملک الموت کی طرح خوف زدہ تھی۔ . . . وہ مجھے میرے خاوند۔ کانٹے میں پھانسی ہوئی مچھلی کی جو حالت ہوتی ہے۔ ٹھیک ویسی حالت میری تھی۔ یعنی مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ناواقف شخص مجھے کانٹے میں پھانسی کر پانی سے لبریز تالاب یا میری محبت سے پر جنم بھومی سے گھیٹتا ہوا خشک زمین پر بیجا رہا ہے۔ اور اِس کے

ہاتھ سے نجات پانی از حد مشکل ہے شادی کے دو ماہ بعد میسر خاوند را ہی ملک عدم ہوئے۔ اُن کو موت پر میسر نزدیکی رشتہ داروں نے بہت اقسوس ظاہر کیا۔ میسر کسمر نے بہت سی نشانیاں ملا کر دیکھا اور ساس سے کہا۔ ”ہمارے سنا ستر جیسے زہریلی لڑکی کہتے ہیں۔ یہی تو ہے۔“ یہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ سننے ہو؟ کیسی اچھی داستان ہے۔

میں نے کہا۔ ”اچھی ہے کہانی کا آغاز نہایت ہی لچپ

ہے۔“

وہ بولی۔ اچھا سنو! میں بڑی خوشی کے ساتھ باپ کے گھر چلی آئی۔ آہستہ آہستہ عمر بڑھنے لگی۔ میں نے باغ شباب میں قدم رکھا۔ چاہے لوگ میسر منہ پر میری خوبصورتی کی تعریف نہ کرتے تھے۔ مگر میں خود خوب جانتی تھی کہ میسر ایسی خوبصورت خاتون عموماً نظر نہیں آ سکتی۔ تمہارا خیال کیا ہے؟ میں۔ ”ممکن ہے تم کسی زمانہ میں حد سے زیادہ حسین ہو۔ لیکن میں نے تو تمہیں بھی نہیں دیکھا!“

وہ بولی۔ "دیکھا نہیں! کیوں؟" — میرا وہ پنجرہ آہ
 آہ... آہ... کیا ٹھٹھا کرتی ہوں

اس کی خوفناک ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا اس نے سلسلہ
 کلام جا رہی رکھتے ہوئے کہا۔

وہ میں نہیں کیسے یقین دلاؤں کہ ان نابینا گھڑوں میں
 پیسے وہ بڑی بڑی - کالی - کالی - جگدار مست زرگسی نکمیں
 تھیں۔ اس وقت کے کھلے ہوئے بغیر مانس کے
 خوفناک دانتوں کے نزدیک ہنسی دیکھ کر تم کیا کوئی بھی قیاس
 نہیں کر سکتا کہ وہاں کسی وقت یا قوت کو مات
 کرنے والے عاشقوں کی اما جگہ ہونٹ تھے۔ اور ان
 کے اوپر دلکش مسکراہٹ رھس کیا کرتی تھی۔ اس
 پنجرہ کی ہڈیوں کے حصوں پر نہایت خوبصورتی۔

عجیب و غریب دلکش اور باغ شباب کے سٹول
 جسم پر سختی — نرمی — پوری طرح شگفتہ کنول کی
 مانند لمحہ بہ لمحہ رکھ رہی تھی۔ تمہارے سامنے یہ
 بیان کرتے ہوئے مجھے ہنسی بھی آتی ہے۔ اور عرصہ
 بھی۔ اس وقت کے بڑے بڑے ڈاکٹر بھی مجھے دیکھ
 کر یہ خیال دماغ میں نہیں لاسکتے تھے۔ کہ میرے اس

جسم سے علم فزیا لوجی بھی سیکھا جاسکتا ہے۔ مجھے اچھے طرح یاد ہے کہ ایک ڈاکٹر نے مجھے اپنے ایک قریبی دوست کے سامنے "حسن کی دیوی" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمام لاشوں سے علم فزیا لوجی اور جسم کے حالات سیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر میں ہی خوبصورتی کا ایک ایسا کنول تھی۔ جو اس کام کے لئے موزوں نہیں۔ کون کہہ سکتا تھا "حسن کی دیوی" بعد از قیاس ثابت ہوگی۔ جب میں زمین کو تھکر کئے ہوئے — ناز بھرے قدموں سے ما پتی تو جیسے بیرے کے متحرک ہونے سے چاروں طرف ضیا کی تھکرکتی ہوئی لہریں پھیل جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح میں اس مجسمہ حسن جسم کے ہر عضو سے خوبصورتی کی ہر نور لہریں ادھر ادھر پھیل جاتی تھیں۔ میں اکثر اپنے ہاتھوں کو گھنٹوں دیوانہ وار آپ ہی دیکھا کرتی تھی۔ دونوں ہاتھ ایسے تھے کہ روئے زمین کی خوبصورتی کے منہ میں لگام ڈال کر اسے اپنے قابو میں رکھ سکتے تھے۔ وہ سمجھ لے جو تینوں عالموں کو حیرت میں غرق کرتی ہوئی اپنے فاتح کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میرے

اپنے خیال میں اسے بھی ایسے لمبے سڈول بازو۔ لال ہفتی اور خوبصورتی کی چوٹی کی طرح انگلیا عطا ہوئی تھیں۔
 میسر اس زیورات سے خالی اور بغیر مالس کے پرانے اور بے شرم ہڈیوں کے پنجرے نہیں جو کچھ بے سلا یا بے بالکل باطل ہے۔ تمہیں یقین کرنا چاہئے کہ میری تمام باتیں سچائی پر مبنی ہیں۔ گونگہ تم اس پر شک لا ضرور کرو گے۔ کیونکہ تمہاری آنکھوں میں اصل صورت کی بجائے ہڈیوں کے پنجرے کی صورت سما رہی ہے۔

کاش! میں سولہ سالہ جوانی اور جوش سے بھرے ہوئے خوبصورتی کے مجھے کو تمہاری آنکھوں کے سامنے کھڑا کر سکتی تو ہمیشہ کے لئے تمہاری آنکھوں سے نیند حرام کر دیتی۔ اور تمہارے دماغ سے اس فضول بے ہودہ بد مزاج علم فزیالوجی کو بیزار کر کے نکال دیتی۔

”بانو! یقین کرو۔ اگر تمہارا جسم ہوتا تو میں اسے چھو کر تمہاری ہی قسم کھاتا کہ میرے فہم میں اس علم کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں رہا۔ اور تمہاری وہ دلکش

عالم شباب کی خوبصورتی کی تصویر شب کے ظلمت
 کدہ پردے کو چیرتی ہوئی شعلہ آتش کی طرح میری
 آنکھوں کے سامنے چمک رہی ہے۔ اب تمہیں اور زیادہ
 کہنے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے کہا: ”خیر جانے دو اور سنو۔ گھر میں میرا
 کوئی اور ساتھی نہیں تھا۔ ہاپ نے شادی نہ کرنے کی
 قسم اٹھا رکھی تھی۔ زنا نے میں اکیلی ہی تھی۔ اپنے
 مکان کے چھوٹے سے جمن میں درخت کے نیچے اکیلی
 بیٹھ کر سو چا کرتی تھی۔ کہ تمام کائنات مجھے الفت کی
 نگاہ سے دیکھتی ہے۔ تمام ستارے مجھے انس بھری
 نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ باد صبر کے نرم اور خوشگوار
 جھونکے جسم سے بغل گیر ہونے کیلئے بار بار پاس
 آتے ہیں۔ جس گھاس پر میں دونوں پاؤں رکھے
 بیٹھی ہوں۔ اگر اس میں حرکت ہوتی تو وہ بھی بت
 کی طرح ساکن رہ جاتی۔ میں اپنے دل میں قیاس
 کرتی تھی کہ عالم کے تمام نوجوان گروہ بنا کر گھاس
 کی شکل میں چپ چاپ میرے پاؤں میں کھڑے
 ہیں۔ اس وقت دل میں بے وجہ ہی خاص قسم کا درد

محسوس ہونا تھا۔

پتا کے دوست ڈاکٹر رام ناتھ میڈیکل کالج سے پاس ہو کر آتے ہی ہمارے گھر کے ڈاکٹر بن گئے۔ میں نے پہلے دروازے کی آڑ میں انہیں کئی بار دیکھا تھا۔ پتا جی بہت ہی عجب انسان تھے۔ البتہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ آنکھیں کھول کر عالم کو دیکھتے ہی نہیں۔ ان کے احباب میں بس ایک رام ناتھ تھے۔ اس لئے

شہر بھر کے تمام نوجوان کی جگہ صرف رام ناتھ ہی میری آنکھوں کو سنبھال پہنچاتے تھے۔ جب مورچ دیوتا دن بھر کی طویل منزل ختم کر کے گوشہ مضرب میں رہ پویش ہوتا۔ اور میں ملک بن کر بڑے درخت کے نیچے بیٹھتی۔ تب جہان کے تمام انسان رام ناتھ کی شکل اختیار کر کے میرے پاؤں میں سرخم کرتے تھے۔ مٹتے ہوئے کیا معلوم ہوتا ہے؟

میں نے ایک ایسی سانس کھینچ کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے۔ میں رام ناتھ ہو کر اسی عالم میں پیدا ہوتا۔ تو اچھا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے تمام داستان تو سن لو۔ ایک دن بادل تھا۔ مجھے ملیریا کی شکایت ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب لکھنے

آئے اُن کے روبرو ہونے کا شاید یہ پہلا ہی موقع
 تھا۔

میں کھڑکی کی طرف منہ کئے لیٹی تھی۔ اس کا مطلب
 یہ تھا کہ شنفق کی لالی میرے سفید بخارزدہ رخساروں کے
 اوپر پڑے۔ تاکہ میرا حسن کھویا ہوا معلوم نہ ہو۔ ڈاکٹر
 نے اندر قدم رکھتے ہی جب ایک بار میرے چہرے کی
 طرف دیکھا۔ تب میں نے دل ہی دل میں خود کو ڈاکٹر
 سمجھ کر سنجیل کے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔
 اس شام کی روشنی میں نرم ٹیکے کے اوپر کچھ مر جھائے
 ہوئے پھولوں کی مانند۔ میرا خوبصورت اور دلکش
 چہرہ رکھا ہوا تھا۔ کانی کالی عجبیں زلفیں ناگن کی طرح
 لہراتی ہوئیں چہرے پر اگنی تھیں۔ سیاہے جھلکی ہوئی بڑی
 بڑی پر نور آنکھوں کی پلکوں کا سایہ رخساروں کے اوپر
 پھیلا ہوا تھا۔

ڈاکٹر نے نرم اور میٹھی آواز میں بتا سے کہا۔

— میں نبض دیکھنا چاہتا ہوں۔

میں نے کپڑے کے اندر سے بیماری کی وجہ سے
 کمزور ہوا ہاتھ باہر نکالا۔ ایک بار ہاتھ کی طرف دیکھا۔

اُس وقت خیال پیدا ہوا۔ اگر نیلے رنگ کی کانسج کی چوڑی پہنی ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

اس سے پہلے میں نے کبھی کسی ڈاکٹر یا وید کو اتنی دیر تک کسی مریض کی نبض دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔ خاص محبت بھرے لہجے میں کانسج کی پٹی ہوئی انگلیاں سے انہوں نے میری نبض دیکھی۔ انہوں نے میرے پیریا کا جوش بھانپ لیا۔ میں بھی تاڑ گئی کہ ان کے دل کے تار کہاں الٹ گئے ہیں۔ اور ان میں سے کسی آواز پیدا ہو رہی ہے۔ کیا تمہیں اعتبار نہیں آتا؟

میں نے جواب دیا۔ مجھے تو یہاں بے اعتباری کی کوئی بات نظر نہیں آتی کیونکہ انسان کی رگیں ہمیشہ ایک جیسی نہیں چلتیں!

وہ بولی "اس کے بعد میں نے چند دنوں میں یہ محسوس کیا کہ میرے شام کے خیالی دربار میں سینکڑوں نوجوانوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے صرف ایک تک آ کر رک رک گئی ہے۔ میرے تجزیے میں زمین آدمیوں سے خالی ہو گئی۔ عالم میں صرف ایک ڈاکٹر اور ایک مریض بچ رہا۔"

آہستہ آہستہ میں صحت یاب ہو گئی۔ اب میں نے اپنے پروگرام میں خفیہ تبدیلی کی۔ میں تخیلے میں پتاجی سے خفیہ بسنتی رنگ کی ساڑھی پہنتی۔ گیسو سنوار کر ان میں گلاب لگاتی اور آئینہ لے کر بڑے درخت کے نیچے جا بیٹھتی۔

اس پر آپ یہ سوال کر سکتے ہیں: کیا اپنے کو دیکھ دیکھ کر طبیعت سیر نہ ہوتی تھی؟ اس کا میں صرف یہی جواب دوں گی: "نہیں ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک وقت میں دو شخصیتیں اختیار کرتی تھی۔ ایک میں خود اور دوسرا ڈاکٹر۔ اس وقت میں اپنی موہنی صورت ڈاکٹر کی الفت بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی اس کے بعد مجھ پر کیوں طاری ہو جانا تھا۔ اور میں بے خود ہو کر بھروسے لگ جا یا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی دل میں شام کی ہوا کی طرح ایک لمبی سانس چکر لگایا کرتی تھی۔ اس وقت سے میں اکیلی نہیں رہی۔ ایسا معنوم ہونا تھا۔ کہ کوئی سائے کی طرح میری نقس و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ میں جب چلتی تھی تب جھکی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی تھی کہ میسکر پاؤں کی انگلیاں زمین کے

اوپر کس انداز سے پڑتی ہیں — ساتھ ہی
 سوچتی تھی کہ میسر ہی چال نئے پاس ہو کر آئے
 ہونے ڈاکٹر کو کس معلوم ہوتی ہوگی۔ دو پہر کو سناٹا رہتا
 تھا۔ سادو داور کوئی چیل آسمان پر بہت دور بول اٹھتی
 تھی۔ چن کی دیوار کے اس پار سڑک پر بساطی۔ سرما۔
 مسی۔ کنگھی۔ چونڈی کی صدا لگا جاتے تھے۔ میں ایک
 سفید چادر بچھا کر اس پر بیٹھتی تھی۔ پھر اپنے ہاتھ کو
 بچھونے پر بے عزتی کے انداز سے لکتے ہوئے سوچتی تھی کہ ضرور کسی
 نے دیکھا ہے۔ بھر خود بخود ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نے
 دونوں ہاتھوں سے اُس کو اٹھا لیا۔ اور میری گلابی ہتھیلی
 کو بوسہ دے کر واپس جا رہا ہے۔ اچھا اگر یہ قصہ
 یہاں ہی تمام ہو جائے تو کیسا ہے؟

میں نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جواب
 دیا۔ "کچھ بُرا تو نہ ہو گا۔ ہاں ناممکن رہ جائے گا۔ مگر
 اسے اپنے فہم میں سوچ کر مکمل کرنے میں باقی رات
 مزے سے گذر جائے گی۔"

وہ بولی۔ "لیکن ایسا کرنے سے کہانی بہت ہی بد مزہ
 ہو جائیگی۔ بھلا پھر اس کی دل کشی ایسی رہ سکتی ہے؟"

اور اس کے اندر لاسٹل کا بجنبر اپنے سب دانت کھول کر کیسے دکھائی دے گا؟ — اچھا اس کے بعد سنو۔ جب ڈاکٹر کا کام کچھہ تیز ہوا تب اُس نے ہمارے گھر کے نچلے حصے میں اپنی ڈسپنسری کھول لی۔ آہستہ آہستہ میرا آنا جانا بھی ڈسپنسری میں ہو گیا۔ میں اس دوران میں ہنسی مزاق میں دوایٹوں کے بارے میں۔ زہر کے بارے میں اُس سے پوچھتی رہتی تھی۔ کئی بار یہ بھی دریافت کیا۔ کہ کیا کرنے سے انسان آسانی سے مر سکتا ہے؟ ان طبی باتوں میں ڈاکٹر کا دل خوب لگتا تھا۔ سننے سننے موت ایسا معلوم ہونے لگی جیسے ہمارے گھر کی ایک فرد ہے۔ اب مجھے محبت اور موت صرف دو چیزیں اس عالم میں ہر جگہ موجود نظر آنے لگیں۔

میسری داستان قریباً ختم ہو چکی ہے۔ مٹھوڑی سی باقی ہے۔ بس۔

میں نے کہا، رات بھی اب مٹھوڑی ہی باقی ہے اس نے پھر کہا۔ چند دن کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کی شادی ہونے والی ہے۔ رات اسی شہر میں جا بیٹی۔ مگر یہ تمام باتیں مجھے شادی کے دن

ہی معلوم ہوئیں۔ اسی دن صبح ڈاکٹر نے آکر کچھ سامان یعنی زیور۔ برتن و غیرہ بتا سے مانگے۔ بتانے مجھ سے سب سامان نکلا کر ڈاکٹر کو دیا۔ مجھ سے نذر ہا گیا۔ میں نے بتا سے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب یہ سامان کیا کرینگے؟

بتانے کہا۔ آج ان کی شادی ہے۔

کیا یہ سچ ہے؟

کہہ کر میں ٹسکرائے لگی۔ پھر دل میں سوچا۔ مجھ سے یہ بات چھپا کر میری بے عزتی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا میں نے ان کو بہو رکھ کے کہا تھا کہ اگر ایسا کر دو گئے تو میری جان کی خیر نہیں۔ مردوں پر یقین کرنا سراسر نادانی ہے۔ اہا ہر نیا میں مجھے صرف ایک ہی مرد سے واسطہ پڑا ہے۔ اور چند سنتوں میں مجھے اس کے بارے میں واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔

دوپہر کے بعد ڈاکٹر ایک بار پھر میرے مکان پر آیا۔ میں نے خواہش سے زیادہ ہنستے ہنستے کہا: "کیا آج آپ کی شادی ہے؟"

وہ میری خوشی دیکھ کر صرف نادام ہی نہیں ہوا بلکہ

بہت اوداس ہو گیا۔

میں نے سوال کیا، "آتشبازی، گیسوں کی روشنی، اور بینڈ وغیرہ کا مکمل انتظام ہے۔ یا نہیں۔"

یہ سن کر انہوں نے ایک کھنڈی سانس لی اور کہا، "کیا شادی اتنی بڑی خوشی کی بات ہے۔"

میں تو یہ سن کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ ایسی بات تو میں نے کبھی سنی ہی نہ تھی۔

میں نے کہا یہ نہ ہوگا۔ آتشبازی، گیسوں کی روشنی اور بینڈ وغیرہ ضرور ہونا چاہئے۔

میں یہ تمام شان و شوکت کے سامان ہیا کرنے کے لئے بتا کے پیچھے پڑ گئی ڈاکٹر کی برات میں براتی زیادہ نہ تھے۔

صرف دو لہنا، پنڈت، اور نانی تھا۔ اور انہیں بھی بہت دور نہ جانا تھا۔ اسی لئے بڑی تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ میری مجبوری پر گیس کی روشنی اور بینڈ کا انتظام ضرور کرنا پڑا۔

چھ بجے کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک بیمار کو دوا دینے کیلئے ڈسپنسری میں آئے مریض کے چلے جانے بعد وہ پتا کے پاس ہی آ بیٹھے۔ پھر ایک ایک گلاس شراب کا

پیا۔ پتاجی کو اور ڈاکٹر صاحب کو شراب کی عادت پڑ
گئی تھی۔

شام ہوئی آہستہ آہستہ چاند نکل آیا میں نے جا کر کہا
ڈاکٹر صاحب کیا بھول گئے۔ برات کب جائے گی؟
یہاں پر یہ بات بھی کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔
کہ میں ڈپینسری سے موقع پا کر کھوڑا سا زہرے آئی تھی۔
وہی زہر آٹکھو بچا کر کھوڑی سی ڈاکٹر والے شراب کے
گلاس میں ڈال دی۔ زہر کہاں پڑی ہے یہ بات مجھے
ڈاکٹر سے ہی معلوم ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے ایک لمحہ میں گلاس خالی کر دیا۔ پھر میری
طرف کزورنگا ہیں ڈال کر بولا۔ "اچھا جاتا ہوں"
ڈاکٹر کے دروازے پر مینڈیکنے لگا۔ میں نے بنا رسی
ساڑھی پہنی۔ صندوق میں جتنے زیور رکھے تھے۔
سب نکال کر پہن لئے۔

سر میں بہت سا سندور لگایا۔ پھر اسی گلشن
میں درخت کے سائے میں سفید چادر بچھا
کر لیٹ گئی۔

نہایت خوبصورت رات تھی۔ کائنات کے ذرے

ذہن سے پرچاندنی رقص کر رہی تھی۔ تمام دن کے تھکے
ماندے ہوئے خواب ذرہ انسانوں کی سٹکاوٹ دور
کرنے والی میٹھی میٹھی عطر بیز ہو اچل رہی تھی۔
جو نہی کہ پھولوں کی خوشبو سے تمام گلشن بہک
رہا تھا۔

بیند کی آواز جب آہستہ آہستہ دُور چلی گئی۔ چاند
چھینے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اسی وقت درخت -
مکان - آسمان - زمین - الغرض تمام کائنات کی چیزیں
بیکر چاروں طرف سے دُور ہٹنے لگیں۔ تب میں آنکھیں
بند کر کے ہنسی اور زہر کی بڑیا کھول کر حلق میں ندیل
لی۔

خواب ہمیشہ تھی کہ جب لوگ آکر دیکھیں گے۔ تب یہی
ہنسی میرے ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ تمنا
تھی کہ جب میں اپنے پیارے سے آخری بار رات کو
سننے جاؤنگی۔ تب اس ہنسی کو فانی دنیا سے اپنے ساتھ لے
جاؤنگی۔

مگر کہاں ہے وہ آخری رات؟ -

کہاں ہے اپنے پیارے کا ملاپ؟

اور کہاں ہے میرا وہ شادی کا لباس؟
 اپنے اندر ایک قسم کی کھٹ کھٹ کی آواز سن کر میں
 چونک پڑی۔ دیکھا تو معلوم ہوا۔ میرا بچھڑے تین
 طالب علم طب سیکھ رہے ہیں۔ دل جو کبھی آرام اور تکلیف
 سے گدگدا اٹھتا تھا۔ اور جہاں روکنا ایک ایک کر کے
 جوانی کے پھول کی پنکھڑیاں کھین رہی تھیں۔ وہاں چھڑی سے
 اشارہ کر کے ماسٹر صاحب لڑکوں کو بتا رہے ہیں۔ کہ اس
 ہڈی کا یہ نام ہے۔ اور اس کا یہ۔ وہ جو آخری ہنسی
 میں سکرانٹوں پر مٹتی۔ کیا اس کی کچھ رگا وٹ تم نے
 دیکھی ہے؟

کہانی کیسی معلوم ہوتی ہے؟
 میں نے کہا ” بڑی دلکش ہے۔“
 اسی وقت ایک کوآ۔ کاؤ۔ کاؤ کرنے لگا۔ میں نے

پوچھا۔

”کیا ابھی یہاں موجود ہو؟“

”کچھ جواب نہیں ملا۔“

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کرے میں صبح کی
 سفیدی دروازے کے سوراخوں سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

اور باہر گلی میں ایک سادھو پھیر سی لگا رہا کھٹا - اور لگا
رہا کھٹا -

یہ دُنیا ایک کہانی ہے

ہر چیز جہاں کی فانی ہے

کیا مان ہے با با دولت پر

اس عزت پر اس شہرت پر

کبھی آنی ہے کبھی جانی ہے

یہ دنیا رام کہانی ہے



زلزلہ

(۱)

شب تاریک تھی۔ دن کے تمام کام ختم ہو چکے تھے۔ سب نے خیال کیا کہ شب کا آخری پہان بھی آچکا ہے۔ گاؤں کے تمام پھانگ مقفل ہو چکے تھے۔ لیکن بعض کا خیال تھا۔ کہ ابھی بادشاہ نہیں آیا۔ ہم ہنستے اور کہہ دیتے۔ یہ ناممکن ہے۔

ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ ہم نے کہا کچھ بھی نہیں۔ شمعیں گل کر دی گئیں۔ اور ہم دروازے ہو گئے۔ بعض نے کہا کوئی قاصد ہے۔ ہم کھل کھلا کر ہنس پڑے اور کہا۔

و محض ہوا کا ایک تند جھولکا ہے۔

(۲)

نصف شب کو آواز سنائی دی ہم نے خیال کیا۔ بہت دور کسی قسم کے گرج ہے۔ زمین کانپی۔ دیواریں لرزا کھٹکیں۔

نیدیں اُچاٹ ہو گئیں۔ کئی بولے۔ یہ رمتھ کے بیوں کی آواز ہے!
مگر ہم نے نیم خوابی کی حالت میں جواب دیا۔ بادلوں کی
خراگڑا ہٹ ہو گی!

شب بدستور بہت ناک اور سیاہ تھی۔ اتنے میں سنگھ
بجا اور آواز سنائی دی۔ ”ہوشیار ہو جاؤ۔ تاخیر کرنے
کا وقت نہیں۔ ہم سنے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ اور کانپ
اٹھے۔ بہت سی آوازیں آئیں۔
وہ بادشاہ کا ہریم ہے۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ”اب دیر کا موقع بالکل
ہیں رہا۔“

(۱۳)

بادشاہ آگیا ہے۔ مگر روشنی کدھرت ہے ہا رکس جگہ ہے؟
اورنگ کہاں ہے؟ ان فضول باتوں کو چھوڑ دو!۔ خالی ہاتھ اُس
کو خوش آمدید کہو۔ اور انہیں بے سرو سامان گروں میں اتارو
دروازے کھول دو۔ سنگھ سجاؤ۔ اپنی بوسیدہ چٹائی لاؤ۔ اور
صحن میں بچھا دو۔ کیا یہ سب سامان ناکافی ہے؟ طوفان کے
ساتھ ہماری بہیب شب کا بادشاہ بھی ناگہاں آگیا ہے۔“
”گیتا سنجی“

کاپیٹ

(۱)

گوپا حسین مٹھی مگر کسن مٹھی
 نیام ساگیروں کو لوٹ گھیٹ کر گزارہ کرتا تھا۔ مگر گوپا
 نے نامعلوم کس وقت اس کا دل چرا لیا۔ اُسے خبر تک
 نہ ہوئی۔

وہ اُسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ مگر ٹھنڈی سانس
 کھینچ کر رہ جاتا تھا۔ آہ! کیا وہ بچھ لیے رہن اور
 اُچکے کی مجبو بہ بنا گوارہ کرے گی۔

(۲)

گوپا نان شینہ تک سے محتاج مٹھی۔ دل سے بھی ہا تھا
 دھو بیٹھی — راجتا کی شیدا ہو گئی۔

راجکار نے محبت کا جواب محبت سے دیا۔ مگر والدین کا خوف حصول کامیابی میں روٹا اٹکا رہا تھا۔
 ادھر شیام کی برداشت کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ وہ
 حسن کی درگاہ میں نیاز مند ہوا۔ اور اپنا تمنائے وصال اس
 کے سامنے رکھ دیا۔ مگر نیاز مند با نیاز نہ ہوا۔
 —————
 منت سماجت کار آمد ثابت نہ ہوئی،
 سفلی محبت فوراً آتش زیر پا ہو گئی۔

(۳۱)

اب بھی وقت ہے۔ اپنا فیصلہ تبدیل کر لو۔
 مگر گویا خاموش تھی۔ اس کی زبان میں نہ حرکت آئی تھی۔
 نہ آئی۔

مگر بچارے آنسوؤں کو رحم آ گیا۔ وہ چھلک پڑے
 اور ایسا کام کر گئے۔ جو بعض اوقات مسکراہٹ سمجھی نہیں
 کر سکتی۔ شیام کی زبان تبدیل ہو گئی۔
 وہی شیام جو غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ گویا کے قدروں
 پر گر پڑا۔

(۳۲)

گویا نے اپنے خواب راجکار کے لئے اور صرف راجکار

عشق کہتا ہے کہ عالم سے جدا ہو جاؤ
 حسن کہتا ہے جد ہر دیکھو نیا عالم ہے
 لوگوں کا خیال ہے - یہ آواز کسی دوسرے کی نہیں
 بلکہ شیام کی ہوتی ہے !

جیب جیب جیب جیب جیب جیب جیب جیب

طائر خیال

(۱)

بے مہاروں کے سہارے اے چین دلوں کی نسکین
تو کہاں ہے؟

برسوں تیری تلاش میں موسم گرما کی کڑکڑاتی ہوئی
دہوپ میں جاڑے سے پر شور ابر آلود بادلوں کی بیتناک
گرج میں جب کہ نیلگوں سائیاں سیاہ دکھائی دیتا
ہے۔ اور بارش نہایت خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ
موسلا دھار برسی ہے۔ سرگرداں رہا ہوں۔ ٹہنوں تیری
جستجو میں دیرو حرم میں بھٹکتا پھرا ہوں۔ کئی
دفعہ عیش و نشاط کی محفلوں۔ ساقی کے جام۔
باغ کے معطر پھولوں کی مہک۔ ہری۔ ہری۔
ڈالیوں۔ سرسبز پتوں۔ خوشنما کبار لیوں۔ اور

صبح کی سنہری کرنوں میں تلاش کیا ہے —
 مگر تو نہیں ملا ۱۱

اکثر اوقات عالم ہو کی تاریک شب میں جب تمام
 کائنات پر خواب کا سایہ ہوتا ہے۔ ندی کے پُرسکوں
 آب میں۔ سمندر کی خوفناک ظالم خیز لہروں میں۔
 تلاش کرتا ہوں۔ جب وہاں سے مایوس ہوتا ہوں
 تو خطرناک جنگل میں۔ جس پر کہ دہشت ناک
 سناٹا چھایا ہوا ہوتا ہے۔ تجھے ڈھونڈتا ہوں
 — ”مگر ناکام“

کئی دن تیری ہی تلاش میں۔ شہر۔ وادی۔ کوہ
 چوٹیاں۔ آبشار۔ میدان۔ بیابان۔ ریگستان ایک
 کر دیئے — ”مگر تو نہ ملا۔ لیکن تیری تلاش
 بدستور جاری رہی“

سوتا ہوں تو تجھیں اکثر تیری کھوج میں ہوائی گھوڑے
 پر سوار ہو کر نامعلوم کہاں ہے۔ کہاں پہنچ جاتا
 ہے۔۔۔ ”مگر سب کچھ بے سود“

(۲۱)

یہ تمام میری کوتاہ اندیشی ثابت ہوئی ۱۱

آخر میں نے تجھے پالیا۔ اب تو میرے گریاس ہے۔
 ادھر ہے۔ ادھر ہے۔ نیچے ہے۔ اوپر ہے۔ گویا جس طرف
 بھی دیکھتا ہوں۔ تجھے پاتا ہوں۔ عالم کا ذرہ ذرہ
 تیرے نور سے بڑ نور ہے۔ خورشید و آفتاب تیری
 ہی ضیا سے روشن ہیں۔ نفع ستارے تیرے ہی
 کرم سے جھللا رہے ہیں۔ اب میرے دل کا دروازہ
 کھل چکا ہے۔ اور میں تجھے اپنے من کے مندر میں
 براجمان دیکھتا ہوں۔

عورت

- (۱) عورت کا دل محبت کے پانی سے سیراب و شاداب کیا گیا ہے۔
 ہمارے قوانین کی نسبت عورت کی نگاہوں میں کہیں
 زیادہ طاقت اور اثر ہے۔ — "شکسپیئر"
- (۲) جس مکان میں عورت نہیں۔ سمجھ لو کہ اُس مکان میں
 شگفتگی۔ بشارت اور مسرت کا گزر نہیں — "ٹامس ہڈ"
- (۳) دنیا بھر میں کوئی لعل کوئی ہیرا اتنا بیش بہا نہیں ہوتا جتنی
 کہ ایک پاک باز اور عفت مآب عورت۔ خصوصاً جبکہ وہ حسین
 بھی ہو — "رینالڈ"
- (۴) عورت دنیا کی زینت۔ ملکوں کی آبادی اور قوموں کی
 عزت ہے۔ — "حالی"
- (۵) اگر دنیا میں عورت نہ ہوتی تو مسرت کا لفظ کسی زبان کی
 لغت میں نہ مل سکتا۔ کیونکہ عورت مسرت ہے۔ — "ٹوئیر"
- (۶) عورت کے جذبات محبت اس قدر عیق ہوتے ہیں کہ ان کی
 نہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو ان
 جذبات کی پر لطف گہرائیوں میں کھو جائیں — "ہومیر"

گنبدہ ستارے

(۱)

میں اپنی نظم کا پانچواں شعر موزوں کر رہا تھا۔ یکایک ملازم کے ارتعاش پذیر پاؤں کی آہٹ نے طلسم تجیل کو درہم برہم کر دیا۔ شیرازہ جذبات منتشر ہو گیا۔ جھٹلا کر پوچھا۔ ”کیا ہے ہا“
اس نے دو ملاقاتی کارڈ میسر سے رکھ کر کہا۔

”حضور! دو فرشتے“
”فرشتے؟“ میں نے استعجاب انگیز لگا ہوں سے ان کارڈوں پر نظر ڈالی۔

ایک کارڈ ہلائیں اور دوسرا فائیل کا تھا۔ واقعی دونوں فرشتے تھے۔ اور مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے مسرت آگیاں انداز سے کہا۔ ”نہایت احترام سے اندر

۷۶

نظم کے لئے جن تخیلات کا میر سے دماغ میں اجتماع
 تھا۔ اُن کو محو کر کے مسرت جلوہ فگن ہو اٹھی —
 میرا گھر — اور فرشتے؟ — میں جیسے خوشی سے
 دروازہ کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ اُسے اے اے!
 اُن کا لباس — مختلف اقسام کے رنگ برنگ
 لیکن نہایت ہی دل فریب پروں کا تھا۔ قوس قزح
 کی مانند خیرہ کن رنگین شعاعیں لباس سے نکل
 نکل کر میسر کمرہ میں بجلی ریز ہو رہی تھیں۔ ایسا
 معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہمیں رنگ کی برف پر خاور
 اعظم کی احمہ میں شعاعیں بھڑک بھڑک کر دلکشی اور بستی
 کے سامان پیدا کر رہی ہیں۔ کسی پر سے ارغوانی شعاعیں
 نکل رہی تھیں کوئی گنگا جمنی کرنوں کا احساس کرا رہا تھا۔
 ہاتھ کے اشارے سے میں نے انہیں بٹھا کر نہایت
 نرم لہجہ میں تشریف آوری کا باعث دریافت
 کیا۔

بلائیل نے خنداں پیشانی اٹھا کر کہا "مختصراً یہ سے
 کہ!! سولہ سال کا عرصہ ہوا۔ موسم بہار کی وہ کیف اور

رات تھی۔ ہم دونوں ایک بھر قالین پر بیٹھے ہوئے
 آسمان پر عالم اجرام میں اٹنا کھیل رہے تھے۔
 د محاف کہجئے گا — میں فقرے کے اختتام سے
 پشتری بول اٹھا "میرا خیال تھا آسمان نیسی قام
 ہے"

"ہاں" — ہلائین نے کہا — گہرائی کی افراط
 کی وجہ سے آسمان کئی جگہ نیلگوں ہے۔ لیکن ایران کی
 طرف سے سبزی مائیل ہے۔ اور دیدہ زیب
 "میں خاموش سنتا رہا"

"انٹے کی بجائے" — ہلائین نے سلسلہ تقریر جاری
 رکھتے ہوئے کہا۔ ہم نے عالم سماوی کے دو سب سے
 خوبصورت ستاروں کو توڑ لیا تھا۔
 "چھڑیاں کس چیز کی تھیں؟"
 میں نے پوچھا۔

"ہم نے — ہلائین نے جواب دیا۔ دو دم دار
 ستاروں کی دُئیں استعمال کی تھیں۔ کھیل نہایت
 پُر لطف تھا۔ میں غائب تھا۔ اور یا فائیل مغلوب
 یکایک زور زور سے مارنے پر دونوں ستارے کنارہ

سے پار ہو گئے۔

”پھر؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں“ کنارہ سے پار — قالین کے کنارے سے پار ہو گئے۔ میرے دوست۔ یہ امر نہایت تکلیف دہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ لرزہ خیز آسمان سے دو ستاروں کا گم ہو جانا قیامت سے کم نہیں — آہ — اب خداوند تعالیٰ کا حکم ہے۔ کہ! جب تک ہم ان دونوں ستاروں کو تلاش کر کے ان کی جگہ اویزاں نہ کر دیں۔ بہشت میں کسی طرح بھی داخل نہیں ہو سکتے۔ نہ راحت فردوسی اور عشرت آرام سے نطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ سزا نہایت تکلیف دہ ہے۔ آہ! سولہ سل کے طول طویل عرصہ میں ہم نے کراہِ ارض کا ذرہ ذرہ چھان ڈالا۔ لیکن ستارے نہ ملے اور نہ ملے۔

میں نے کہا۔ ”اب کیا ہو گا؟“

”سنو“ یوں تو ہم مایوس ہو کر یہ لرزہ خیز مزا تادمِ حیات بھگتنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن — ہاں — پاس کی ہیستناک تاریکی میں شجاع امید منور ہو اٹھی۔

اور اُسے لئے اُس امید پر آپ کے پاس آئے
ہیں۔

”یعنی“؟ — میں نے پوچھا۔
”ہم نے ایک حسینہ کی پُر اسرار آنکھوں کی شہرت
سنی ہے۔ اور وہ آپ کی بیوی ہے۔“

میری بیوی؟

مجھے ایسا احساس ہوا۔ جیسے کوئی میری گردن
پر رسی کا پھندا ڈال کر کسی تاریک غار کی جانب کھینچ
رہا ہے۔

”ہاں“ تمہاری بیوی؟ — ہم نے جو کچھ
سنا ہے۔ اگر وہ صبح ہے۔ تو اُس کی آنکھوں میں
غافی انسان کی روشنی جیسی خوبصورتی نہیں ہو سکتی
اُن ستاروں میں نورِ الہی پنہاں ہے۔ کیا ہم امید کر
سکتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے دونوں ستارے واپس کر
دے گی؟۔

جیسے پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ میرا سر
چکرا نے لگا۔ آنکھوں کے رو برو اندھیرا چھا
گیا

”آہ۔“ جس کی تھکی ریز روشنی سے میرا خانہ تاریک
 بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ وہی آنکھیں کیا مجھ سے چمن جا میں
 گئی؟ کتنا خوفناک مطالبہ تھا۔ گو فرشتوں کی
 گتہ چیز واپس کرا دینا میسر اختیار میں تھا۔
 لیکن — قدرت کی بہترین نعمت واپس کر
 دوں؟

— تاہم میں نے اپنی بیوی کو بلا کر سب کچھ بیان
 کر دیا۔

فرشتوں کے روبرو وہ غیر متزلزل زل چٹان کی مانند
 کھڑی تھی۔ کسی پریشانی کا شائبہ تک نہیں۔ پلکوں
 کو اٹکھا کر بولی۔ نیک فرشتہ میسری آنکھیں
 غور سے دیکھو۔ اور ستاروں کو بھچان
 لو۔

دونوں فرشتے قریب آئے انہوں نے جھکتی ہوئی سحر
 بار آنکھوں میں اپنی نگاہیں ڈال دیں۔ آپس میں
 آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ جیسے دو بیج مشورہ
 کر رہے ہوں۔ پھر تجاہل عارفانہ سے کہا۔ ”نہیں
 نہیں“ یہ وہ سارے نہیں ہیں۔ جو اس سکوت پذیر

رات کے وقت ہماری کوتاہ اندیشی سے گم ہو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ستارے موسم بہار کی کیف انگیزات میں انہیں کی طرح ضیا پاشی کر رہے تھے۔ لیکن ان میں ایسی دل کشی نہ تھی جو ان آنکھوں میں موجود ہے۔

فرشتے مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ مجھے ان کی حالت زار پر رحم آ رہا تھا۔ تاہم میں خوش تھا۔ وہ میری بیوی کی درختوں آنکھیں میرے پاس ہی چھوڑ گئے تھے۔

میری بیوی نے فلک شگاف قبضہ لگا کر کہا۔
میری ماں نے سنا یا تھا۔ کہ جب میں پیدا ہوئی۔
درینچہ سے داخل ہو کر دو ستارے میری آنکھوں میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ لیکن فرشتوں کو میں نے دھوکہ دے دیا۔

تو کیا فرشتے دھوکہ میں آ گئے؟
”ہاں“ جب وہ میری آنکھیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کے روبرو تخیل گذشتہ کی لہروں کا جال تن دیا تھا۔

ہاں میں سے پیار سے پہلی بار۔ جب تم نے و فور مجھ
 سے بیتاب ہو کر وارفتہ وار مجھے اپنے سینے سے لگا
 کر کہا تھا۔ "جان من"؟ میں خوب جانتی تھی۔ کہ اس
 وقت کا وجد آفرین تخیل بیسری آنکھوں کو ہی نہیں بلکہ
 قلب کے دو ستاروں کو کہیں دلفریب دلکش بنا دینگا۔

"فرانیسی"

حسن کا جادو

(۱)

وہ زاہد تھا۔ آٹھوں پہر ریاضت میں مشغول رہتا۔
 اس کا واحد کام تھا۔ دریا ئے راوی کے کنارے اس
 کی ایک معمولی پھولنس کی جھونپڑی تھی۔ اس کی سفید
 ڈاڑھی بارونق چہرہ۔ کمرہ میں قدرے خم اور منور آنکھیں
 جادو اثر رکھتی تھیں۔ لوگ بے ساختہ کسی مقناطیسی قوت
 کے زیر اثر اس کی جانب کھینچے چلے آتے تھے۔ جس
 وقت آفتاب عالمتاب دن بھڑکی مسافت طے کر کے گوشہ
 مغرب میں رویو میں ہوتا۔ اور شفق کی سرخی مائل
 خوشنما روشنی آسمان پر کھلنے لگ جاتی۔ تو ایسے منظر
 کے وقت بہت سے خدا پرست لوگ اس کے گرد
 اکھٹے ہو جاتے۔ اور وہاں کافی دیر تک دہرم گرم

کی باتوں کا چرچا ہوتا رہا۔
 لوگ اُسے دیتا سمجھتے اور اس کے عالمانہ الفیتِ حق
 میں ڈوبے ہوئے اپدیشوں نے اس کی بزرگی کا سکہ اُن پر
 مضبوطی سے بٹھا دیا۔ لوگ گھروں کو لوٹ جاتے۔ تو
 وہ جھونپڑی میں واپس آجاتا۔ اور شب کے بقیہ لمحات
 اینٹور بھگتی میں صرف کر دیتا۔

اس کا ایک چیدہ تھا۔ رنگ ناسخہ۔! جوان خوبصورت
 اور سڈھل! اُس کے نقش و نگار پر بھتر دل کو بھی رام کر لیتے
 تھے۔ بچپن سے ہی وہ بہا تاجی کے ساتھ تھا۔ اور
 جوان ہونے تک وہ بھی اینٹور کی بھگتی اور بہا تاجی کی
 سیوا میں لگا رہا۔

(۲)

اندرا ایک حسن فروش حسینہ! اگرچہ خود کو بازارِ حسن
 میں فروخت کر چکی تھی۔ اور ایک ذلیل ترین پیشہ اختیار
 کئے ہوئے تھی۔ تاہم حقیقت میں وہ ایسی نہ تھی۔ سینہ
 پر بھتر رکھ کر وہ مجبوراً یہ ناپاک فعل انجام دیتی تھی۔ ورنہ
 اس کے سرد سینہ میں بھی لاکھوں چنگاریاں دمن کھیں۔
 جنہیں ظاہر کرنا اُس کی طاقت سے باہر تھا۔ بسا اوقات

وہ عالم تختیں میں کہہ اٹھتی ، بھگوان ! کیا دنیا کو مجھ جیسی عورتوں کی بھی ضرورت تھی؟

جب اس کی طبیعت حد درجہ غمگین اور بے چین ہوتی تو وہ لب دریا جا کر اپنا غم غلط کرنے کی ناکام سعی کرتی۔ مگر اس سے اُس کی بے چینی بجائے کم ہونے کے بڑھ جاتی۔ ایک روز وہ دریا کے کنارے ٹہس رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر رنگ نامتہ پر جا پڑی۔ جو اپنی کشکول کو دریا میں ڈبو رہا تھا۔ اُس کی نرگسی آنکھیں بھی سطح آب سے اٹھ کر اندر کی نرگسی آنکھوں سے دوچار ہو گئیں۔

رنگ نامتہ کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ جیسے آسمان پر بجلی کو ندی اور اس کے تمام جسم میں کبھی پیدا ہو گئی۔ عشق کے اندھے دیوتا کا تیرا اُس کی آنکھوں کے راستے سے داخل ہو کر دل میں بیوست ہو گیا۔

(۳۴)

اندھانے ساد ہو کی کٹیا پر رونا نہ آنا۔ اپنا معمول بنا لیا۔ وہ آتی اور گشتوں رنگ نامتہ کے ساتھ پیار و محبت کی گفتگو میں مشغول رہتی۔ رنگ نامتہ بھی اب وہ پہلا رنگ نامتہ نہ رہا۔ اس کی حالت میں انقلاب آ گیا۔ اُس کے

آئینہ دل میں اندرا کی تصویریں نفس رہتی۔ اور وہ ہر
 وقت نہایت بے چینی کے ساتھ اس کی آمد کا منتظر رہتا۔
 اندرا آتی تو رنگ نامتھ پر کیف طاری ہو جاتا۔ جیسے چکور
 چاند کو دیکھ کر بے خود ہو جاتا ہے۔ یا موسم بہار میں
 کوئل پر خود رفتگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔
 رنگ نامتھ اندرا کے عشق میں اپنا ایشور بھگتی سے
 لبریز دل کھو بیٹھا۔

(۴۷)

ایک روز ہاتما جی نے رنگ نامتھ کو اپنے پاس بلا کر

کہا۔

رنگ نامتھ! تم نہایت خوفناک راستہ اختیار کئے ہوئے
 ہو۔ جو یقیناً تمہاری تباہی کا باعث ہوگا۔

ڈگور دیو! میں بالکل بے بس ہوں۔ اور ساحرہ کے
 سحر سے مسحور ہوں۔

لیکن یاد رکھ! تو جس راستہ پر گامزن ہے۔ وہ بڑا
 بھیاٹک اور خار دار ہے۔ قدم قدم پر تکلیفوں اور مصیبتوں
 کے خونخوار اژدھے منہ کھولے ہوئے ہیں۔ اب بھی
 وقت ہے۔ سمجھ جا۔۔۔۔۔ اور سنبھل جا!

”مگر..... گورو دیو!“

کچھ بھی ہو۔ تمہارے سامنے اس وقت دو راستے ہیں۔
ایک ہان سیدھا اور بے خطر ہے۔ مگر دوسرا تباہ کن
اور خطرناک! تم جو راستہ اختیار کرنا چاہو۔ آج کر لو۔ یا
تو آج سے اندر سے ملنا ترک کر دو۔ یا آج اس
جھونپڑی کو خیر باد کہو۔

”گورو دیو!..... ہمت!۔“

”نہیں۔ ہمت ہرگز نہیں مل سکتی۔ جو کچھ سوچتا ہے۔
اُسے ابھی کہہ ڈالو!“

دوسرے دن انہ بازار حسن میں اندر تھی۔ اور نہ
پھولنس کی جھونپڑی کے دروازہ پر رنگ تاکہ! سے
غضب کی چیز ہے یہ حسن انسان لاکھ بچتا ہے
مگر دل کھینچ ہی جاتا ہے! طبیعت آہی جاتی ہے

عورت کی ساخت

- | | |
|--|-------------------------------------|
| ۶۔ ضیاء کا تابش حسن | ۱۔ ماہ کامل کی بجلی |
| ۷۔ سانپ کی مسرت خیر حیا کی شگفتگی | ۳۔ بیدہ بجنوں کی ولع فریب لچک |
| ۸۔ معطر بھونکی پر سحر و جادو کی نزالت اور بی | ۵۔ باد صحر کی وضاحت اور سیلاب مزاجی |
| ۹۔ آہو کی جہالاک نشئی - الفت امینہ پر کعبہ لکھیں | ۶۔ طاؤس کی خود پرستی |
| ۱۰۔ کبوتر کی صمم بلخی | ۹۔ طوطے کا شور |
| ۱۲۔ تیر کی بید | ۱۱۔ یونینڈین کی بچیدگی |
| ۱۴۔ برف کی خندانگ | ۱۳۔ آتش کی تپش |
| ۱۶۔ ضیورہ کی خارہ دلی | ۱۵۔ حلو سن کی بزدلی |
| ۱۸۔ موم کی نرمی | ۱۶۔ امیر سے کی سختی |
| ۲۰۔ صبر کی گڑبگڑ | ۱۹۔ شہد کی موماس |
| ۲۲۔ قطب کی مسکنی | ۲۱۔ بجلی کی تراب |
| ۲۴۔ بتوں کی مختصر کھراہٹ | ۲۳۔ چٹان کی مضبوطی |
| ۲۶۔ پرو نیکا بدکا پن | ۲۵۔ طلا کا وزن |
| ۲۸۔ ابر باران کی زاری | ۲۶۔ شہر کا کینہ |

ان تمام وصفانی منتشر اور صاف کو یکجا کر کے قدرت نے ایک مجموعہ بنایا اور اپنی بینظیر و اسرار و پیچیدہ صنعت کا راز دلشت از پیام کر دیا۔ پھر صنم نلوک کے نام سے منسوب کر کے مرد کی نذر کیا۔

محبت کی دنیا

صبح کا فرحت خیز وقت تھا۔ سورج نئی بیاہی دلہن کی طرح شرمیلی لگا ہوں سے سُرخ چادر میں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر سرخی چھا رہی تھی۔ شاید یہ خون تھا۔ جو شب کی دیوی کی لاش سے نکل رہا ہو۔ جس کو دن کے دیوتانے قتل کر دیا تھا!

گلشن پر بہار میں عندلیبان سخن لغمہ سرا تھے۔ چمن کے ذرے ذرے میں رعنائی تھی۔ حسن تھا۔ لڑکپن کی شوخی تھی۔ عطر بیز ہوا کے خوشگوار جھونکے دماغ کے پردوں کو ہلا ہلا کر دل پر قبضہ کر چکی بے سود کوشش میں مشغول تھے۔ کیونکہ اس پر کسی اور کا تسلط تھا۔

میں اور وہ — میرے دل کا فاتحہ ایک

مولسری کے درخت کے تنے کے ساتھ کھیر لگائے گفتگو محبت
 میں غرق تھے۔ ہمیں اس دُنیا کے کام کی —
 گردش کی — مطلق پرواہ نہ تھی۔ ہماری
 دنیا — محبت کی دنیا — اس فانی دنیا سے
 بالکل مختلف تھی۔ عالم کے جھگڑوں سے دور —
 بہت دُور —

میں نے اس کی نگاہیں ہیں معنی فیض نگا ہیں
 ڈالیں۔ وہ میری آغوش میں گر گئی۔ اُس نے اپنی کالی
 کالی آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ اور پھر بار
 چپا سے بند کر لیں۔ میری انگلیاں اُس کی عنبریں
 زلفوں سے کھینچ رہی تھیں۔ ہم دونوں کے لب
 وصال کے لئے بیقرار تھے۔

زلزلہ آیا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا سر بہ
 فلک پہاڑیاں سرنگوں ہو گئیں۔ پستی پند آسمان
 کو ہم گنار کرنے کی سعی کرنے لگا۔ بحروب میں کوئی
 نمایاں فرق نہ تھا۔

ہم کسی دوسری دنیا میں حرام ناز تھے۔ ہمیں
 کچھ بھی خبر نہ تھی۔ کہ کیا ہو رہا ہے —

اس طوفان سے کوئی نہ بچ سکا - زمین و آسمان
 میں امتیاز کرنے والا کوئی نہ رہا - خون کی ندیاں بہ
 نکلیں - وادی و کوہ سہارا لاشوں سے پٹ گئے -
 شاید — اس کا نام قیامت تھا - اور یہی وجہ
 تھی کہ انسانی شکل اس طرح محذوم ہو چکی تھی - جیسے کبھی
 عالم وجود میں آئی ہی نہ ہو -

اب گلشن میں کوئی نغمہ سرائے تھا - تمام شجر و گل زمین
 بوس ہو رہے تھے - وہ پیڑ جس کے سہارے ہم بیٹھے
 تھے گر چکا تھا - مگر ہمیں کیا؟

ہماری کائنات اس کائنات سے مختلف تھی - وہ اب
 بھی میری آغوش میں تھی - میری نظریں اس کی نظروں
 میں تھیں - میری انگلیاں اس کی عنبریں زلفوں سے
 کھیں رہی تھیں - ہمارے ہونٹ اب بھی ہلکی سی جنبش
 کرتے نظر آ رہے تھے -

”راپچھاہٹ“

کیا تم نے کبھی غور کیا ہے؟
کہ چڑیا اور فاختہ کیا کہتی ہے؟

انگلستان و ترکی کی چڑیا یہ کہتی ہے۔ ”میں پیار کرتی
ہوں اور پیار کرتی ہوں!“

سردیوں میں جب وہ خاموش ہوتی ہیں۔ اور ٹھنڈی
ہوا میں چلتی ہیں۔ اس وقت جو کچھ کہتی ہے۔ میں نہیں
جانتا۔ وہ ایک اونچا راگ گاتی ہے۔ لیکن ہرے ہرے پتے —
دھوپ والا موسم گرما... گانا اور محبت کرنا۔ سب اکٹھے واپس آتے ہیں۔ میں
پیار کرتا ہوں، غالباً تمام پرندے کہتے ہیں۔

صبح سے لیکر شام تک وہ بہت خوش رہتے ہیں۔ مگر چندول ان
سب سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔

سبز کھیت نیچے اور نیلگوں آسمان اوپر دیکھ کر اتنا مست ہو جاتا ہے
اور گاتا ہے۔ ہمیشہ گاتا ہے۔

زیرانی مجبور سے پیار کرتا ہوں۔ اور میری مجبور مجبور سے پیار کرتی ہے۔

مُصَوِّر

(۱)

مصوّر نے اپنے نئے شاہکار کو جس پر اُس کے دماغ کی تمام قوتیں ضرور چلی تھیں ہاتھ میں اٹھائے ہوئے کہا ۔

”بہت خوب! بہر ادب کے ایڈیٹر کے دماغ میں جگہ کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ آج وہ جاے میں پھولا نہ سمائے گا۔ اس قسم کا نیا تخیل تو میرے خیال میں آج تک کسی بھی ادبی رسالے نے شائع نہیں کیا۔ پھر اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے بولا ۔

”ہاں تم نے وہ کام کیا جو آج تک اعلیٰ سے اعلیٰ مصوّر بھی نہ کر سکا ہو گا۔ بس اب ایک ماہ آرام کی ضرورت ہے مگر آرام کہاں ایڈیٹر نہایت سنگدل واقع ہوا ہے۔ پچھلے سال بھی تو اسی طرح کا ایک بالکل نیا تخیل پیش کیا تھا۔ مگر اجرت

وہی معمولی۔ ایٹور جانے آج کیا ظہور میں آتا ہے۔ مگر آج بھی اس نے ایسا ہی کیا تو اس کام سے دست بردار ہو جاؤنگا۔ مکمل ایک ماہ پانچ دن کی محنت کا خمیازہ کیا وہی ملے گا۔ جو دس دن کی محنت سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ مگر نہیں۔ پھر بھی اُس کی آنکھیں ہیں۔ دماغ ہے۔ اور ان تمام باتوں کے باوجود وہ قیافہ شناس قابیل فہم تجربہ کار ایڈیٹر ہے۔ خود بخود اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے مضمور اٹھا۔ الماری سے کاغذ نکالا۔ تصویر کو اس میں اچھی طرح لپیٹا۔ اپنا پھٹا پیرا نا کوٹ اتار کر پہن لیا۔ خستہ حالت چار پائی سے پگڑی اٹھا کر سر پر رکھی۔ ان تمام کاموں سے فرصت پا کر کمرے میں ایک بھڑکتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ جس میں اُس کی خود ساختہ اور کئی کسی کی یادگار تصاویر آویزاں تھیں۔

اس کے بعد اُس نئی تصویر کو اٹھا کر کمرے سے باہر نکلا۔ دروازہ مقفل کرنا ہوا۔ شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اور اس انداز سے ٹہلنا ہوا۔ جھومتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جیسے قاروں کا خزانہ ہاتھ آنے والا ہے۔

(۲)

دیوان چند معمولی دوکاندار تھے۔ ان کا کاروبار کوئی

زیادہ وصیح نہ تھا۔ گذار سے کیلئے کمائی تھی۔ بزرگوں کی پونجی لڑکی کی شادی پر صرف ہو چکی تھی۔ ایک لڑکا تھا۔ جو اس سال ملل کا فائنل امتحان دینے والا تھا۔ بھگوان نے انہیں یہی دو بچے عطا کئے تھے۔ اس نازک زمانہ میں روپیہ جمع کرنا بساط سے باہر ہے۔ لڑکا جوان ہو رہا تھا۔ دیوان چند کو خیال تھا۔ کہ لڑکے کی شادی جلدی ہو جائے۔ مگر روپیہ کچھ کرنے نہ دیتا تھا۔

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ دنوں کے بعد مہینے اور مہینوں کے بعد سال گذر گئے۔ پریم نامتھ میٹرک میں کامیاب ہو گیا۔

اس گورنمنٹ کے عالم میں ہوشیار۔ دیانتدار۔ محنتی اور تمام عیبوں سے بالاتر لڑکا ملنا نہایت ہی مشکل ہے۔ مگر ایشور کی قدرت و تمام باتیں پریم نامتھ میں موجود تھیں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ پتا کی دوکان پر ہی بیٹھ گیا اور اس نے بتا دیا کہ کاروبار کو اس طرح عروج پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ دو سال کے قریب عرصہ میں ہی سکائیوں کے لئے کئی جگہ سے فرمائش آئیں۔ مگر دیوان چند ایک نہ مانتے تھے۔ وہ یہ بات خوب جانتے تھے۔ کہ اب کاروبار میں اضافہ

ہو رہا ہے۔ لڑکا ہونہار ہے۔ ایسے لڑکے کے لئے کسی اچھے
 خاندانی اور امیر گھر کی لڑکی ہی آنی بہتر ہے۔
 وہی ہوا جو دیوان چاہتے تھے۔ رمداس کے ایک ساہوکار
 نے دیوان چند سے آکر کہا۔ کہ لڑکا میرا ہو چکا۔ دیوان نے چند اس
 کو انکار نہ کر سکے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ ان کا کاروبار لاکھوں
 کے میدان میں گامزن ہے۔ ہمیں مالا مال کر دیں گے۔
 لڑکے کی قسمت بیدار ہو چکی ہے!

باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ لڑکی کی ماں کو اس جہان سے
 رخصت ہوئے دس سال کا لبا عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر دیوان چند
 نے اس بات کی کوئی خاص حقیقت نہ سمجھتے ہوئے نظر انداز
 کر دیا۔

چھ ماہ کے بعد پریم پائی کی شادی بڑی شان و شوکت سے
 ہوئی۔ لڑکی والوں نے توقع سے زیادہ جہیز دیا۔ دیوان چند
 کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر جو قرض لڑکے کی شادی پر لیا تھا۔
 وہ اسی طرح سر پر ہی رہا۔ بے شک جہیز میں سینکڑوں
 کے کپڑے آئے۔ مگر کیا انہیں بازار میں فروخت کرتے۔
 ہزاروں کے زیورات لے تھے۔ مگر انہیں بھی فروخت کرنے
 سے ناک نہیں بچ سکتی تھی۔ جو کچھ روپیہ ملا تھا۔ وہ ادھر

اُدھر کے حساب میں ختم ہو گیا ۔
 پریم ناتھ کو شادی کے دو ماہ بعد بیوی کا منہ دیکھنا نصیب
 ہوا ۔ پریم ناتھ کی خوشی کی دکان تھی ۔ بیوی حسین تھی ۔ طرح
 دار تھی ۔ اُس کی آنکھیں جادو سا اثر رکھتی تھیں ۔ اُس کی
 ہر ادھر پریم ناتھ کے دل و جگر میں بیہوش ہو رہی تھی ۔ مگر
 یہ تمام خوشی دس دن کے محوڑے عرصہ میں ہی بسر کر لی ہو
 گئی ۔

اُس کی بیوی کچھ عجیب قیاس کی واقع ہوئی تھی ۔ اُسے
 جو بات کہی جاتی اس کے برخلاف چلنا اُس کا واحد کام تھا ۔
 اس کی خاص وجہ یہ تھی ۔ کہ کبھی عمر میں ہی تارا کی ماما
 دوسرے جہان میں چلی گئی تھی ۔ اب اُس کو سمجھانے
 والا کون تھا ۔ جو اُس کے دل میں آنا کرتی ۔ والد تھے ۔
 وہ صبح اپنی آڑبہت کی دوکان پر چلے جاتے ۔ پھر گیا تھا ۔ تمام
 دن لڑکیوں میں کھیل کود کر ختم ہو جاتا ۔ تارا کا ایک بھائی
 تھا ۔ ودیا ساگر ۔ بی ۔ اسے پاس کرنے کے بعد اُس کی شادی
 ہو گئی ۔ بیوی نہایت سلیقہ شعار ۔ ذہین اور قابل تھی ۔
 ہر ایک بات کی طہ تک پہنچتی تھی ۔ اُسے تارا کا یہ
 تمام دن کا پروگرام پسند نہ آیا ۔ اُس نے آہستہ

آہستہ شیریں گفتار سے تارا کو سمجھانا شروع کیا۔ مگر تمام بے سود۔ اُس کا نتیجہ ہی مقابل نکلا۔ تارا نے اپنے والد سے کئی طرح کی جھوٹی شکایتیں لگاتی شروع کر دیں۔ کئی آدمی کچھ عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طرف ڈگری دے دینا اُن کے لئے معمولی بات ہے۔ تارا کے والد نے بہو کو سخت سست کہنا شروع کر دیا۔

بملا نہایت ہوشیار تھی۔ صرف اشارے سے ہی سمجھ گئی۔ کہ یہ بات ہے۔ اُس کے بعد اُس نے تارا کو سمجھانا تو درکنار کوئی کام کہنا بھی ترک کر دیا۔ تھوڑے عرصہ کے لئے تارا کے آگے ایک چٹان کھڑی ہو گئی تھی۔ جو اس نے تھوڑی سی ہمت کے ساتھ دُور پھینک دی۔

(۳۲)

تارا نے اپنی تیرھویں سالگرہ میں قدم رکھا۔ زما زخواب تھا۔ تارا عالم شباب میں تھی۔ اُس کا خداداد لاثانی حُسن آنکھوں کے راستے اُتر کر دل پر اپنا تسلط جمالیتا تھا۔ اُس کی عنبریں زلفیں زہریلے سیاہ سانپ سے کم نہ تھیں۔ اُس کی سرنگیں آنکھیں زہریں کچھے ہوئے تیرھے۔ جونی انٹرنس میں پڑتا تھا۔ نیک تھا۔ خوش مزاج

مقا۔ ہنس نکھا تھا۔ مگر کسی نے خوب کہا ہے۔ جوانی مستانی ہوتی ہے۔ چونی کا بھی وہی حشر ہوگا۔ وہ تارا کے دامِ محبت میں گرفتار بلا ہو گیا۔

صبح سکول میں جانا مگر دل شمع تارا کے گرد پروانے کی طرح گھومنا کرتا۔ گھر آتا تو تمام دن کھڑکی میں بیٹھ کر گزار دیتا۔ جب کبھی تارا نظر آتی۔ تو دل پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتا۔

تارا کا والد زمانہ ساز تھا۔ اُس نے پرانے زمانے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ گیا۔ کہ دال میں کالا ضرور ہے۔ اب تارا کی شادی کا سوال دامن گیر ہوا۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ ناظرین جانتے ہیں۔

مگر چونی اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ اور نہ ہی میٹرک کے امتحان میں پاس ہو سکا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا اس نے اسی سال سکول کو خیر باد کہا۔

(۴)

پریم ناتھ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اُس کی زندگی خراب رہی ہو گئی۔ وہی پریم جو ہر لمحہ خوش و خرم تھا۔ اب مغموم نظر آنے لگا۔ بیوی نے اُسے ناکوں چنے چھوا دیئے۔

اُس پر طرہ یہ کہ نا تجربہ کاری نے اُسے دوکان کے کام سے بھی بے فکر کر دیا۔

بزرگوں نے سچ کہا ہے۔ کہ قرض مباحی ہے۔ ماہ بہ ماہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ وہی حال دیوان چند سے ہوا۔ قرض بڑھنے لگا۔ آمدنی کم ہو گئی۔ مگر وہ لڑکے کو بھی کیا کہہ سکتے تھے۔ پریم کی پریم آنکھیں دیکھ کر اُن کا دل بیٹھ جاتا۔ یہ پریم کے کسی پچھلے جنم کا پھل تھا۔

پریم کی آہ رسا نے خوب کام کیا۔ اُس کے نالے فلک کے پردوں کو چیرتے ہوئے خالق کے کانوں تک جا پہنچے۔ تا راکو امید واری ہو گئی۔ پھر مقررہ دنوں کے بعد اُس کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی۔

دیوان چند کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس نے دل میں خیال کیا۔ اب لڑکی سدھر جائے گی۔ اور پریم کی زندگی رنگین بن جائے گی۔ مگر دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں لڑکی تولد ہونے کے بعد تاسا چار پانی سے نہ اٹھ سکی۔ اس کی لاش ہی گھر سے نکلی۔ پریم نے دل ہی دل میں خالق کا شکر ادا کیا۔

شیر خوار بچہ ایک ہوشیار دایہ کے حوالے کر دیا گیا۔

وہ اُس کی پرورش میں ہمہ تن محو ہو گئی۔ اب پریم کی دوسری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مگر پریم کو مطلق خبر نہ تھی۔ اپنے شہر میں ہی ایک سا ہو کار سے بات بکلی کر کے دیوانچند نے پریم سے کہا۔ وہ جیسے خواب سے چونک پڑا۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تمام جسم تھرا اٹھا۔ سر سے پاؤں تک ایک برقی لہر دوڑ گئی۔

اُس نے کہا

بیٹا جی کیا میں نے پہلی شادی میں راحت کا دیدار کیا ہے۔ جو اب آپ مجھے دوسری شادی کے لئے کہہ رہے ہیں آپ سچ سمجھیں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد انسان کی دردشا ہوتی ہے۔ تو میں کبھی بھی اس خوفناک دلکش صحرا میں قدم نہ رکھتا۔ اچھا وہ تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ مگر اب مجھے اس دہشت خیز گڑھے میں نہ دھکیلیں۔ زیست کے جو چار دن باقی ہیں۔ انہیں آرام سے گزارنے دیں۔ اگر ایٹور کو منظور ہوا تو بچی کی شادی دیکھ لیں گے۔ اب تو یہی براہ مہضنا ہے۔

دیوانچند نے لاکھ سمجھایا مگر پریم کی اٹل تھی۔ وہ

طوفان خیز سمندر میں تھا۔ جیسے پانی کے غضب ناک پھپھیرے بھی نہیں ہلا سکتے۔ پریم کو اس کی ماں نے بھی خوب سبھایا۔ مگر پریم کی نہیں نہیں تھی! والدین جھکنے کو تو جھک گئے۔ مگر انہیں یہ غم اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا گیا۔ پریم کی والدہ کمزور تھی۔ وہ اسی غم سے نڈھال ہو کر دو سرے سال اس عالم سے رخصت ہو گئی۔

اب دیوان چندا اور پریم کا سہارا صرف وہ تین سال کی لڑکی تھی۔ مگر فرشتہ اجل یہ دیکھتا اور مسکرا دیتا۔ شہر میں چیچک کی نامراد بیماری پھیل گئی۔ پریم کی لڑکی بھی اُس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اور تیسرے دن دوسری بے فکر دنیا کی طرف کوچ کر گئی۔ دیوان چندا شدت غم سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ ان کے روندھے ہوئے گلے سے نکلا۔ بھگوان ہمارا مایا۔

دیوان چندا بے ہوش ہو گئے۔ مگر یہ بے ہوشی مسلسل ہی رہی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ ہارٹ فیبل ہو گیا ہے۔ پریم بچا رہتا تجربہ کار اس عالم خون ریز طلاطم میں اکیلا محض اکیلا تھا۔

دیوان چند کی آنکھیں بند ہوتے ہی قرض خواہوں نے پریم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اُس نے خیالاً اندازہ لگایا کہ قرضہ جائداد سے کہیں زیادہ ہے۔ خود بخود ندامت سے سر جھک گیا۔ پیشانی پر سرد پانی کے قطرے نمودار ہوئے۔ پانچویں دن پریم کو تمام شہر میں تلاش کرنے کے بعد بھی پولیس نہ پاسکی!

(۵)

کدو دہلی کا مشہور آرٹسٹ تھا۔ مگر دنیا سے بالا تر۔ جیسے کنول کا پھول پانی میں رہتے ہوئے بھی پانی سے جدا ہوتا ہے۔ یہی حال کدو کا تھا۔ اُس کی شہر کے باہر پھوس کی جھونپڑی تھی۔ مگر اندر قدم رکھتے ہی انسان محو حیرت رہ جاتا تھا۔ اُسے کوئی نئی دنیا وہاں نظر آتی تھی۔ اُس کی جھونپڑی کے مختصر کمرے میں کروڑ ہا روپے کے تخیل نصاب ویر کی شکل میں آویز تھے۔

مکن ایک ماہ کے پیدل سفر کے بعد پریم اُس جھونپڑی کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد آواز آئی

”کون ہے؟“

”ایک بھولا بھٹکا مسافر!“

اس کے بعد دروازہ کھولا۔ ایک لمبے قد کے دبّے پتلے آدمی نے باہر سر نکالا۔

”کیا چاہتے ہو؟“

”صرف سات بس کر رہی ہے۔“ پریم نے عاجزی سے جواب دیا۔

”بھائی تم لباس سے امیر معلوم ہوتے ہو۔ کسی ہوٹل میں جاؤ اس بے سرو سامانی جھو پٹری میں کیا کرو گے؟۔ جہاں دو پھٹی پرانی چٹائیاں اور چند برتن کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”میں دنیا کے خوفناک ہاتھوں سے ستایا ہوا بے یار و مددگار انسان ہوں۔ جس کے لئے ہوٹلوں میں جگہ نہیں۔“

کدار کے دل میں یہ لفظ تیر کی طرح لگے۔ اُس نے

پریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اندر لے گیا۔ کدار کی یہ تمام شب

پریم کی افسوس زدہ دلچسپ داستان سنتے سنتے ختم ہو گئی۔

پھر اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ پریم اب کسی جگہ نہیں جا سکتا۔ اسی

جھو پٹری میں رہے گا۔

اس بات کو دس سال کا لمبا عرصہ گزر گیا۔ شام کا وقت

تھا۔ پرندوں کے غول کے غول اپنے گھونسلوں کی طرف جا

رہے تھے۔ کوئل نے بھی الوداعی راگ چھیڑ رکھا تھا۔

جھونپڑی کے گرد پھلواڑی میں پیسہ کہا۔ پنی کہا کی صدالگا
 رہا تھا۔ جھونپڑی کے اندر پریم ہاتھوں میں بٹن لے
 صبح کے نکلے ہوئے سورج کی کرنیں ایک پردے پر بنا
 رہا تھا۔ اُس کے پاس ہی کدار سر جھکائے کسی گھرے
 خیال میں متغرق بیٹھا تھا۔ یکا یک کدار نے سر اٹھایا۔ اور
 نہایت تیر میں لہجہ میں کہا۔

بس اب تم نے میری جگہ پر مکمل طور سے قبضہ کر لیا
 ہے۔ تم اس کام میں مجھ سے ایک قدم آگے نکل گئے ہو۔
 اب مجھے اجازت دو تاکہ میں کسی جنگل میں جا کر ایٹور کو تلاش
 کروں۔ دیکھو کام کرنے کرنے کر میں خم آگیا ہے۔ ہاتھوں
 کی بینائی آدمی سے زیادہ کم ہو چکی ہے۔ اب اس دنیا
 سے دل بچین ہے۔ کافی رنگ دیکھے ہیں۔ اب زیادہ دیکھنے
 کو دل نہیں چاہتا۔ کیوں پریم سنئے ہو؟

پریم نے سر اٹھایا۔ اور کدار کے چہرے پر پُر نم آنکھوں
 سے ٹٹکی باندھتے ہوئے کہا۔

ہاں سب سن رہا ہوں۔ مگر کیا سن رہا ہوں۔ یہ ابھی تک
 نہیں سمجھ سکا۔ ایٹور جانے آج آپ کیسی دل ہلا دینے
 والی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ میسگر رازق ہیں۔ آپ کی بدولت میں

اس جہان میں زندہ ہوں۔ آپ کی مہربانی سے ہی میری زندگی کی یہ چند ناخوشگوار لمحے خوشی میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ یہ تمام باتیں ہوتے ہوئے بھلا میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں میرے لئے تو سب کچھ آپ ہی ہیں۔ سیوک کو گلے لگا کر نہ ٹھکرائیں !

کدو نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پھر سراٹھایا۔ اور اپنی اندر کدو دھی ہوئی آنکھیں پریم کے چہرے پر لگاتے ہوئے کہا — سچ کہتے ہو مگر یہ سب کچھ کرنے والا بھگوان ہے۔ بھلا میری کیا بساط تھی۔ انسان کے دل میں کچھ ہوتا ہے۔ مگر قدرت کے دل میں کچھ اور۔ انسان بنانا ہے۔ اور قدرت گرا دیتی ہے۔ انسان گراتا ہے تو قدرت اُسے کھڑا کر دیتی ہے۔ ایشور کی باتیں اٹھاہ میں۔ میں تو کوئی چیز ہی نہیں۔ صرف اُس کا بھیجا ہوا ناقابل فہم۔ نکما۔ بیوقوف۔ اور زندگی سے یسزرا ہوا ہوا ایک کھلو نا ہوں۔ پریم نے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔ ”تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں !“

”جب تمہارا موقع ہوگا۔ تم خود ہی چلے جاؤ گے۔ میرے ساتھ لے جانے یا نہ لیجانے کی چنداں ضرورت نہیں۔“

ہاں میری نصیحت یاد رہے۔“

دو بارہ یا دو گناہ کرادیں۔

”اپنی ایک تصویر فروخت کرنے کے بعد دوسری اس وقت بنانا جب پہلے روپے ختم ہو جائیں۔ امیرانہ سٹاک میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ اس پھوس کی جھونپڑی میں غزبی کی حالت میں رہنا۔ میں خوب جانتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو ہزاروں روپے پیدا کر سکتے ہو۔ تم کامیاب تصویر نگار ہو۔ مگر یاد رہے امیروں کے گھر میں اس کا گزر نہیں۔ امیر ظالم۔ شفاق اور بے رحم ہوتے ہیں۔ مزدوروں کا خون چوسنا ان کا سب سے اول کام ہے۔ وہ سیر ہی نہیں بنا۔ جس نے غزب کو ہڑپ نہیں کیا۔ مگر برخلاف اس کے پھوس کی کلبیا میں غزبوں کی جھونپڑی بھگوان کی نگاہیں اقص کستی ہیں۔ اس کی دلکش ہنسی کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ غزبی میں کوئی فکر نہیں۔ مگر امیری میں ہمیشہ جان و مل کا فکر و امن گیر رہتا ہے۔ پریم میری اس نصیحت کو بھولنا نہیں دل پر نقش کر لینا۔ کام کی باتیں ہیں۔“

اسی رات پریم کو بے خبر چھوڑ کر گدار جھونپڑی سے باہر

نکل گیا۔

(۶۱)

آج تین ماہ بعد ایک ہینے کی کوشش سے پریم نے ایک تصویر تیار کی تھی !

رام لعل راحت بہر ادب کے ایڈیٹر تھے۔ پرچہ کامیاب تھا۔
 نئے نئے شاہکار۔ عمدہ تصاویر۔ بلند پایہ نظمیں یہی وجہ تھی کہ
 اُسے کافی مقبولیت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے راحت صاحب کا
 دماغ بھی عرش بریں پر پرواز کرتا تھا۔ کسی معمولی آدمی
 کی اُن کی آنکھوں کے سامنے کوئی حقیقت نہ تھی !
 ایڈیٹر صاحب دفتر میں تشریف فرما تھے۔ کہ پریم کمرے میں
 داخل ہوا۔ راحت نے ایک بار میز سے آنکھیں اوپر اٹھائیں
 اور پھر مضمون لکھنے میں محو ہو گئے۔
 پریم پانچ منٹ کھڑا رہنے کے بعد بولا : ایک نئی تصویر
 لایا ہوں !

”ہاں بیٹھو۔ مجھے سمجھو اس کام ختم کر لینے دو۔“
 پریم پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کامل ایک گھنٹہ
 بعد ایڈیٹر صاحب نے سر اٹھانے ہوئے کہا۔
 ”دکھاؤ۔“

پریم نے تصویر آگے رکھ دی۔ ایڈیٹر صاحب پر سکتہ

طاری ہو گیا۔ کبھی تصویر اور کبھی پریم کی طرف دیکھتے۔ مگر جلد ہی اپنی حیرانی کو دور کرتے ہوئے بولے۔

”بہت تنگ دفت میں آئے ہو۔ ہمارا ہرچہ بیس تار بیخ کو غٹاؤ ہوئے والا ہے۔ ہاں ایسے چھوڑ جاؤ۔ پہلی تاریخ کو اپنا حساب لے جانا۔ کام زیادہ ہے۔ اور وقت نا کافی۔ اس لئے کہتا ہوں۔“

پریم زبان ہلائے بغیر کمرے سے باہر ہو گیا۔

پریم کے چلے جانے کے بعد صاحب نے ایک دفعہ پھر تصویر اٹھائی۔ اور پھر کہتے ہوئے اُن کی زبان سے نکل ہی گیا۔ ”واقعی عمدہ چیز ہے۔“ پھر میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔

پیڑ سی اندر داخل ہو کر با ادب کھڑا ہو گیا۔ جاؤ ہاں ٹون کپنی کے مینجر کو بلا لاؤ۔ مگر جلدی“

پیڑ اسی واپس چلا گیا۔ راحت صاحب پھر اپنے خیالوں میں غرق ہو گئے۔ اُن کی نگاہیں۔ تصویر کے ہر ایک حصہ پر رقص کر رہی تھیں۔ ایک دماغ تھا۔ اور ہزاروں خیالوں کا ہجوم۔

اتنے میں کرشنا کپنی کے مینجر نے کمرے میں داخل ہو کر

خیالات کا تانتا توڑ دیا۔ ایڈیٹر نے تصویر دکھانے ہوئے کہا۔
 "اس کا بلاک تین دن میں تیار کر دیں۔ تین چار دن
 چھپنے میں لگ جائیں گے۔ آج بیس تاریخ ہے۔ اور ہمارا
 سالانہ نمبر بیس تاریخ کو شائع ہو جائے گا۔"
 "آپ آج ہی کاغذ بھیج دیں۔ اٹھ بیس تاریخ کو چھپی ہوئی
 تصویر آپ کے آفس میں پہنچ جائے گی۔"

"بہت بہتر!"
 "کرشنا ہان ٹون کمپنی" کے منیجر نے تصویر اٹھائی اور آداب
 کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بہر ادب کا سالانہ نمبر نکلا۔ دھوم مچ گئی۔ باقی تمام ادبی
 رسالوں سے سبق لے گیا۔ جس نے دیکھا محو حیرت ہوا۔ افسانے
 بکھے تو وہ چوٹی کے انشا پردازوں کے۔ تصاویر بھی تو وہ
 نامور مصوروں کی۔ مگر جو تصویر سب سے اول لگائی گئی تھی۔
 اُسے جو دیکھتا دل پکڑ کر رہ جاتا۔ تصویر کے سامنے تصویر
 ہو جانا۔ بہر ادب کے چار صدے خریدار کھڑے ہو گئے۔
 باقی پرچہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگا۔

دن گذر گئے آج یہی تاریخ تھی۔ پریم اپنی مختصر کہلیا
 سے نکلا اور شہر کی جانب روانہ ہوا۔ چاندنی چوک سے

گذر رہا تھا۔ کہ اچانک اُس کی نظر بہرا دہ پر پڑی۔ وہ
ایک سٹال پر ٹھہر گیا۔ سالانہ نمبر تھا۔ حجم کافی تھا۔ تصاویر کئی
مگر سب سے اول تصویر پر نظر پڑھتے ہی اُس کی روح کانپ
اٹھی۔ دماغ میں ایک خیال نے چٹکی لی اور وہ دیوانہ وار
بہرا دہ کے دفتر کی طرف بھاگا۔ سالنامہ کی اول تصویر
اُس کے دماغ کا جدید اختراع تھا۔

پریم کا جو سن ناقابل برداشت تھا۔ مگر پھر بھی اُس نے
ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ حسب معمول نہایت آہستگی سے کمرے میں
داخل ہوا۔ ایڈیٹر صاحب نے خلاف معمول کہا۔

”پریم جی آئیے۔ تشریف رکھیے۔“

مگر پریم جو سن میں اندھا ہو رہا تھا۔ کھڑے کھڑے ہی
کہنے لگا۔ میرے خیال میں آپ نے تصویر کا فیصد کر لیا ہوگا۔
”ہاں اچھی ہے۔ آپ اپنی اجرت لے جائیں۔ یہ کہتے کہتے
ایڈیٹر نے ہنسی پڑی ہوئی چک بک اٹھائی اور بیس روپے
کا چک کاٹ کر پریم کی طرف بڑھا دیا۔

پریم نے چک دیکھا تو اندر ہی اندر جل بھسن کباب ہو گیا
ایڈیٹر صاحب بھانپ گئے اور بولے
”کیوں کیا سوچتے ہو؟ تمہاری تصویر آئینہ پرچہ میں شائع

کرنے کا ارادہ سے " اجرت بہت کم ہے۔ میں پچاس روپے سے کم ہرگز نہیں لے سکتا۔ میسٹر کمں ایک پانچ دن کی دماغ نمونی کا نتیجہ صرف ایک وہ تصویر ہے۔ کیا انصاف دنیا سے غائب ہو چکا ہے۔ کیا مزدوروں کا مٹا گھوٹنا ہی سرمایہ داروں کا شیوہ ہے۔

راحت صاحب ایسی جلی کٹی بائیں سننے کے عادی نہ تھے۔ نہایت جوش سے تصویر نکال کر پریم کے اگے رکھ دی۔ اور کہا نے جاؤ ہمیں ایسی تصویر کی ضرورت نہیں۔ آئندہ اس کمرے میں قدم نہ رکھنا۔

ان تمام باتوں نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ پریم کا جو سن بھڑک اٹھا۔ اُس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "آپ تمام بائیں آدمیت سے بچ کر رہے ہیں۔ جھوٹ بولنا آپ ایسوں کا شیوہ نہیں۔ تصویر سالانہ نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ اور آپ کہتے ہیں آئندہ نمبر میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اب اسے کون خریدے گا۔

پریم کی اس بات سے ایڈیٹر صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ندامت سے سر جھٹک گیا۔ آنکھیں میز پر جا لگیں۔ مگر دیکھ

ایک خیال آیا۔ اب آنکھوں میں پھر وہ غصہ اور وہی جوش
تھا۔ سالانہ نمبر نکالتے ہوئے بولے۔

”یہ دوسرے مضمون کی چیز ہے۔ دیکھو اس میں میری
تصویر بھی ساتھ ہی دکھائی گئی ہے۔ مگر تمہاری تصویر میں
یہ جگہ نہیں!“

پریم نے دیکھا۔ واقعی ایک کونے کو کاٹ کر ایڈیٹر کی
ایک رنگی تصویر لگائی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بلاک
تیار ہوجانے کے بعد اسے کاٹ کر وہ تصویر لگائی گئی ہے۔ مگر
باقی تخیل تمام پریم کا تھا۔
پریم نے کہا۔

”تمام تصویر میرے دماغ کا خیال ہے۔ یہ تصویر بعد میں
لگائی گئی ہے۔“

”تو کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟“

”ہاں۔ بالکل۔ سفید۔“

ایڈیٹر نے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر سے باہر

نکل جاؤ۔“

پریم نے میز سے تصویر اٹھائی اور اس کے ٹکڑے کر کے

میز پر پھینک دیا۔ پھر ایک بار ایڈیٹر کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال اور کمرے سے باہر ہو گیا !

تیسرے دن ایک گڈریسے کی اطلاع پر پولیس نے آکر

دیکھا کہ پھلواری کے پودے سر جھکائے کھڑے تھے۔ کٹیا پر

حسرت برس رہی تھی۔ کدار کے دماغ کے تمام نایاب تجزیں

ردی حالت میں زمین بوس تھے۔ پریم کا چہرہ زہر کے

اثر سے نیلا پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر کی زبان سے معلوم ہوا کہ

ظانر کو پرواز کئے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں !

راحت صاحب نے یہ سب سنا تو سر پکڑ کر رہ گئے۔ انہیں

اس انجام کی مطلق خبر نہ تھی۔ انہوں نے بہر ادب میں

پریم کی فوٹو شائع کی۔ آئیکل لکھے۔ اس کی سوانح حیات

قلم بند کی۔ بے شک کو بتا دیا کہ پریم بہترین مصور تھا۔

سالانہ نمبر والی تصویر فروری کے پرچم میں پھر شائع کی گئی۔

اور اس کے نیچے لکھا گیا۔

پریم کا آخری تجزیں

اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

کرشمہ حسن

(۱)

قیدی نے پہرے دار کے منہ پر اپنے جسم کی پوری قوت
 سے تھپڑ جمایا اور بولا: "بس یہیں پڑے رہو"
 پہرے دار تھپڑ کی تاب نہ لاسکا۔ اور جٹم زدن میں زمین
 پر آ رہا۔ اب کامیاب قیدی کے چہرے پر خوشی رقص
 کر رہی تھی۔ اُس نے پہرے دار کا بھاری جسم کھینچ کر
 اندر کر لیا۔ اور اپنے کپڑے اُس سے تبدیل کر
 لئے۔

اب وہ قیدی نہیں بلکہ سپاہی تھا۔
 نقلی سپاہی رات کی خوفناک تاریکی کو چیرتا ہوا لہ
 بہ لمحہ آگے بڑھنے لگا۔ کیونکہ اُس کے تمام ساتھی
 خواب غفلت میں مدہوش تھے۔ اس لئے کسی کو

مطلق خبر نہ ہوئی۔ کہ ساتھ والے کمرے میں کیا ظہور میں
میں آیا ہے۔

قیدی جلدی ہی سمندر کے ساحل پر جا پہنچا۔ جہاں
ایک کشتی تیار تھی۔ جس پر ایک شخص اپنا سراپا سیاہ
لبادے میں چھپائے کسی کا منتظر بیٹھا تھا۔ سیاہی کے
قدم رکھتے ہی کشتی بجلی کی سی تیزی سے پانی کی خوفناک
لہروں کو کاٹتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

(۲)

”پیارے یہ چند دن کی جدائی میرے لئے
کہتے کہتے شو شیل کا گلا بھرا آیا اور نازک رخساروں پر
آنسوؤں کے چند گرم قطرے ڈھلک آئے، گوپال شو شیل
کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکا اور بے قرار ہو کر لولا:
”پیارے شیل تمہاری پُر نَم آنکھیں میرے جگر پر
چھری کا کام کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جیب سے
رومال نکال کر شو شیل کی آب گوں آنکھیں پونچھ دیں۔
شو شیل!۔ پران ساتھ کیا آپ کو میرا خیال دو دن
میں ہی بھول گیا تھا! مگر نہیں!۔
گوپال! شو شیل آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔

صرف ایک دن کی جدائی کا اس قدر صدمہ - مجھے یہ
غواب میں بھی خیال نہ تھا -

شو شیلہ: ” پیارے جس وقت سوہن کو اپنے جرم
کا پاداش میں کالے پانی کی سزا ہوئی - اور آپ نے کہا -
میں کی مدد ضرور کرنی چاہیے - نہیں تو یہ بچارا ایسی ہتھک
بلکہ سے واپس نہ آسکے گا - میں اسی دن سے
سمجھ رہی تھی - کہ سوہن کی جگہ آپ کالے پانی جا

سے ہیں -
گوپال: ” مگر سوہن کی جگہ میں نے کس صفائی سے

تھی -
شو شیلہ: ” چاہے کچھ بھی ہو مجھے ایسی باتیں اچھی -
میں لگتیں -

گوپال - یہ کیوں؟

شو شیلہ - اس لئے کہ آپ اپنی زندگی ایک -!

گوپال - مگر اس پر بھی -!

شو شیلہ: ” میں سب کچھ جانتی ہوں - پیارے اس پر
جی آپ کو سینکڑوں جرائم پیشہ لوگ استاد کے پورٹ نام سے
بکارتے ہیں - ہزاروں عقلمند جاسوس آپ کی دانائی

اور ہتکنڈوں کے آگے ناک رگڑتے ہیں۔ مگر پھر بھی آپ
 اُن کی نظروں میں محض ایک ڈاکو کی حیثیت سے زیادہ وقعت
 نہیں رکھتے۔ جب کبھی موقع ملا وہ آپ کو ماکھن کے
 بال کی طرح نکال کر پھینک دیں گے۔
 اب کشتی کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ اس لئے گفتگو کا
 سلسلہ بھی یہیں ختم ہو گیا۔

(س)

زمین دوزخ خانہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گوپال نے
 کہا: "شیش تمہارے خیال میں آج کا دن اچھا ہے۔
 شو شیلہ!۔ بہت ہی اچھا ہے۔ پیارے! کھلا کام
 کرنے کے لئے سارے دن ہی اچھے ہوا کرتے ہیں۔ کسی
 نے سچ کہا ہے سے

تخم نیکی رائیگاں جاتا نہیں
 کر کھلا تیرا کھلا ہو جائیگا

گوپال: "شیش تم دھنہ ہو..... اے حسن تجھے

پر نام! شو شیلہ۔ وجہ

گوپال۔ اس لئے کہ تم نے میری زہریلی زندگی کو آپ جیت

کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ کیا یہ خواب میں بھی خیال ہو
 سکتا تھا کہ اس قدر عجیب و غریب اور عظیم الشان انقلاب
 پیدا ہوگا۔ اور اپنا سب کچھ قربان کر دوں گا۔ تمہارے
 بغیر ایسی کوئی ہستی نہیں تھی۔ جو مجھے میرے اس گندے
 ارادے سے باز رکھی۔

شوخیلا! اچھا جانے دیں۔ پھر کبھی ایسی باتیں
 ہوں گی!

دوسرے دن ہی شہر میں ایک دفتر گوپال اینڈ کو کے
 نام سے کھول دیا گیا۔ جو چند ہی دنوں میں ترقی کے شکم
 پر جا پہنچی۔

عورت مرد

عورت کی زبان تین اینچ سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی۔ مگر بد مزاجی پر چھ فٹ لمبے مرد کو نیچا دکھا سکتی ہے۔

مرد ادا سے کاہکا۔ ٹھنٹی۔ چالاک اور مستانہ ہوتا ہے۔ عورت مستحل مزاج

امن پسند۔ محبت کی دلدادہ اور ہر حالت میں ایک جیسی رہتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مرلاد اعلیٰ ڈاکٹر اور عورت عمدہ نرس بن سکتی ہے۔

عورت کا دل اٹل مگر خیالات محدود ہوتے ہیں۔ مرد کسی شے کو پسند یا نا

پسند کر سکتا ہے۔ مگر عورت اپنے فیصلہ پر ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

عورت سینڈ جھوٹ ساز و نادر بولتی ہے۔ کیونکہ زبان ہلانے سے پیشتر وہ

ہر ایک بات کو تول لیتی ہے۔ وہ اپنے جرم قبول کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ مگر اپنی غلطی کا اعتراف بہت کم کرتی ہے۔

مرد ہر وقت جلد بازی چاہتا ہے لیکن عورت ہر قدم پر آرام سے کام لیتی ہے

مرد کم مگر اکثر محبت کا دم بھرتا ہے۔ عورت بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔ لیکن

صرف ایک بار۔ عورت محبت کی قربان گاہ پر خود کو فنا کر دیتی ہے۔ بر خلاف

اس کے مرد نفسانی خواہش کے زیر اثر ضمیر کی طرح اس عورت کو بھی ٹھکرا دیتا

ہے۔ جس پر جان و دل سے فدا ہو۔

عورت جب تک محبت کرتی ہے۔ لگاتار کرتی ہے۔ مگر مرد کے محبت

کر لینے کا موقع ہوتا کرتا ہے۔

کرنی کا پھل

(۱)

برج لعل امرتسر کے مشہور جواہری تھے۔ لاکھوں
 کا کاروبار تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے رائے صاحب
 کا خطاب عطا تھا۔ ان کی عمر کا کافی حصہ بے اولادگی میں
 گٹا۔ مگر اس آخری وقت میں پرمانے انہیں ایک
 پسر دیا تھا۔ جو ان کی تمام عمر کی کسائی تھی۔
 کوشلیا رائے بہادر مول راج کی لڑکی تھی۔ اور برج
 لعل کی دہرم پتی۔ وہ آخری عمر میں لڑکے کا منہ
 دیکھ کر بھولی نہ سمائی۔ اس کا دل خوشی سے
 نہال ہو گیا۔ جیسے کسی عزیز کو لاکھوں کی دولت
 مل گئی ہو۔ کسان آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے
 امیر کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کی مراد پوری

نہ ہوتی تھی۔ آج ایسور کو اُس کی حالت پر جیسے رحم آگیا ہو۔ کوشلیا کی بھی یہی حالت تھی۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ وہ رامیش کو حد سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ رامیش کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ اُس کے لئے قانونِ قدرت کی طرح اٹل ہو جاتے تھے۔ اسی وجہ سے رامیش اس چھوٹی سی عمر میں شاہِ خرچ ہو چکا تھا۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

رامیش ابھی دس سال کا ہی تھا۔ کہ اُس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ بے چاری کوشلیا پر رنج و الم کے بادل چھا گئے۔ وہ شدتِ غم سے نڈھال ہو گئی۔ مگر پرمانما کے کاموں میں کسی کا ہاتھ نہیں۔ اُس کے نظام کو درہم برہم کرنا انسانی عقل کے بیحد ہے۔

رامیش! باپ کی موت سے بے چین ہو گیا۔ اُس کی دل سوز آہوں نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ کوئی کہتا ابھی بچہ ہے۔ اُس نے باپ کا ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ کوئی کہتا بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ اُسے کس بات کی پرواہ ہے۔ اگر باپ نہیں رہا۔

تو نہ سہی — وہی رامیش جو کل اپنی ہر بات پر مچل بڑتا تھا۔ آج بے یار و مددگار رہ گیا۔

(۲)

رامیش کے پتا کو اس جہان سے رخصت ہوئے پانچ سال ہو گئے۔ اب رامیش نے اپنی پندرہویں سالگرہ میں قدم رکھا۔

رامیش — وہی رامیش جو کبھی فرشتہ تھا۔ آج درندے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ادھر برج محل نے آنکھیں بند کیں۔ ادھر اس کے بد بخت دوستوں نے اس کو گھیر لیا۔ گو اس وقت رامیش کی عمر کوئی زیادہ نہ تھی۔ مگر پھر بھی ورغلانے کے لئے کافی سے زیادہ تھی۔

جو رامیش اپنی ماں کے سامنے آنکھیں اوپنچی نہ کر سکتا تھا۔ آج وہی جلی کٹی باتوں سے اس کا دل چھلنی کر رہا تھا۔ لیکن نیچاری کوشلیا اُن تک نہ کرتی۔ مگر اندر ہی اندر یہ تمام باتیں اس کو کھائے جاتی تھیں۔ آخر ایک دن وہ بھی پر لوک سدھار گئی۔ رامیش کی راہ میں ایک روڑہ تھا۔ وہ بھی

قدرت نے اٹھا لیا۔ اب وہ آزاد تھا — بالکل آزاد۔

اب اُس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اُس نے دوکان پر جانا بالکل ترک کر دیا۔ نوکر خود ہی دوکان کھولتے اور بند کر کے چابیاں گھبر دے آتے۔ رامیش ایک دو منٹ کیلئے دوکان پر جاتا۔ اور واپس آ جاتا۔ اُس کو دوستوں سے فرصت ہی کہاں تھی۔ شام کو مینیم گھر آ کر تمام حساب دیتا۔ اور رامیش شراب کے نشے میں دین و دنیا سے بدست سر ہلا کر اُس کی تسلی کر دیتا۔

یہ حالت کہاں تک رہ سکتی تھی۔ دولت کی دیوبی غالباً اس کے بزرگوں کی بد دعا سے ناراض ہو چکی تھی۔ نوکروں نے مل کر آہستہ آہستہ مال بھنم کرنا شروع کر دیا۔ کوشلیا کے مرنے کے دو سال بعد ہی رامیش کو دیوالے کی درخواست دینی پڑی۔ جو ایک آدھ مکان تھا۔ اُس کو بیچ کر نقد روپیہ اپنے پاس رکھا۔ مگر وہ بھی ایک سال کے قریب عرصے میں شراب کی بوتلوں میں بہ گیا۔ برج لعل کی تمام جائداد تباہ ہو گئی رہائشی

مکان پہلے رہن ہوا آفرید گیا
 رامیش کی بڑی حالت دیکھ کر اُس کے یار دوست بھی
 روفو چکر ہو گئے۔ جن پر رامیش کو مکمل یقین تھا کہ
 موت کے بعد بھی میرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ اُن
 میں سے کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔ اُسے اب معلوم ہوا
 کہ میں خوفناک غار کی طرف جا رہا ہوں۔ جس سے
 بچ کر نکل آنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مگر اب
 کیا ہو سکتا تھا۔ چڑایا ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اب
 صرف اُس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔
 وہی رامیش جس کے سامنے نوکر سرخم حکم کے منتظر نظر
 آتے تھے۔ آج روٹی کے ٹکڑے تک کا محتاج ہو گیا
 کارپردازان قسمت جب گلیم بخت سیاہ بننے لگیں۔
 تو کوئی لاکھ زمزم اور کوثر سے صاف کرے۔ کبھی سفید
 نہیں ہو سکتی۔

(۳۴)

قادر دس نمبر کا بد معاش تھا۔ امیر گھرانوں کے
 لڑکوں کو ورغلا کر اُن کی دولت ہضم کرنا اُس کا کام
 تھا۔ یہی کام اُس نے رامیش سے کیا۔

جب رامیش کسی کام کا نہ رہا تو قادر کے سامنے سرنگوں
 ہوا۔ کسی طرح میری جان بچاؤ۔ نہیں تو میں فاقوں
 کی وجہ سے جان توڑ دوں گا۔ قادر نے زمانے
 میں کئی رنگ دیکھے تھے۔ سینکڑوں نوجوانوں سے
 اس کا واسطہ پڑا تھا۔ اس لئے اُسے رامیش کے
 دل کا حال معلوم کرنے میں دیر نہ لگی۔

”تم میرے مکان میں آنے جانے والوں کو تمباکو
 وغیرہ پلا دیا کرو۔ میں تم کو روٹی کھلا دیا کروں گا
 اگر منظور ہے تو۔“

”مگر مجھ سے یہ ذلیل کام انجام نہ ہوگا۔ جو کبھی
 میسر نکڑوں پر گزارہ کرتے تھے۔ میں ان کی کس
 طرح خدمت کر سکوں گا؟۔“

”ہاں ایک اور کام ہے۔ اگر منظور ہو تو تمہیں کسی
 دوسری جگہ پہنچا سکتا ہوں۔“
 ”یعنی کیا؟“

”مسلمان بننا قبول کرو۔ اس حالت میں کسی جگہ
 نوکری دلا دوں گا۔ پھر تم اپنی باقی زندگی آرام سے
 گزار سکو گے۔“

راہمیش کا سر چکرانے لگا۔ اُس کے دل میں خیال پیدا
 ہوا میں کس انجام پر پہنچا ہوں۔ کسے معلوم تھا۔
 رائے صاحب برج لال کے لڑکے کا یہ حشر ہو گا۔
 قادر کے الفاظ راہمیش کے جگر کو پیر کر نکل گئے۔
 مگر کیا کر سکتا تھا۔ چپ چاپ اس کے مکان سے
 باہر نکل گیا۔ مرکز بھی سانپ کی دہشت نہ گئی۔
 مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ جدوجہد کے بلا فیض
 سمندر میں راہمیش نے بساط سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں
 مارے۔ مگر گرواپ ناکامی نے اُسے اُبھرنے نہ دیا۔
 آدمی کا پیٹ سب کچھ کروا سکتا ہے۔ وہی راہمیش جو ابھی
 عیش و طرب کی مجلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔
 آج نان جوین تک کا محتاج بازاروں میں چکر کاٹ رہا تھا۔
 نگراب اُس شکستہ حال پر کوئی رحم کھانے والا بھی نہ
 تھا۔ پیٹ کی آگ بڑوں بڑوں کے حوصلے پست کر
 دیتی ہے۔ تیسرے دن وہ بھر قادر کے مکان پر پہنچا
 اور پولا۔

مجھے مسلمان بننا منظور ہے ۛ
 اسی دن مسجد میں راہمیش کی چوٹی اور جینوں کا خون کر

دیا گیا۔ اب رامیش - رامیش نہیں - بلکہ یعقوب تھا۔
 قادر نے اسی وقت اپنے ایک شاگرد کو بلا کر کہا - کہ
 اسے کوچوانی کا کام اچھی طرح سکھا دو - اور جب ماہر
 ہو جائے اسے بھی ایک ٹانگہ دے دینا -

ایتور کی مایا عجیب ہے - محلوں میں رہنے والا -
 ہنزادوں کی سی زندگی بسر کرنے والا رامیش - یعقوب
 بنا - یہاں تک قناعت نہ کی - گھوڑوں کی پیدھاں
 کر رہا ہے - سچ ہے - بُرے کاموں کا نتیجہ بُرا ہوتا
 ہے - وہ جن لوگوں کو اپنا دوست سمجھتا تھا - وہ درحقیقت
 اس کے دشمن نکلے - یہ لوگ بظاہر گو سفید سلیم تھے -
 مگر باطن میں خونخوار بھیرے تھے -

یعقوب اب صرف یعقوب ہی نہیں بلکہ کوچوان کا
 خطاب حاصل کر چکا ہے - اسٹیشن سے شہر اور شہر
 سے اسٹیشن تک - سواریاں پہنچانا اس کا کام تھا - ہر
 انگریزی کی پہلی تاریخ کو قادر سے بیس روپے مل
 جاتے ہیں - شراب کا دور پھر شروع ہو چکا ہے -
 بے شک وہ ماضی کو بالکل بھول چکا ہے -
 مگر آج کل دورِ شراب میں پھر بھی دھندلی سی

یاد آ ہی جاتی ہے۔ سانپ گذر گیا تھا۔ مگر لکیر باقی تھی۔ اب رابیش مفلس و نادار تھا۔ مگر شراب اور قمار بازی کا شوق جو اس کا روح رواں تھا۔ نہ گیا۔ اور نہ گیا۔

(۴۴)

سوہن لالہ بنواری لعل کالڑ کا تھا۔ اس کے دو بڑے بھائی اور ایک بھین تھی۔ بنواری لعل کا کراچی میں کپڑے کا کاروبار تھا۔

بنواری لعل کے بال سفید ہو چکے تھے۔ مگر پھر بھی وہ حال کے نوجوانوں سے کم نہ تھے۔ سوہن کی منگنی کے لئے کئی لوگ آئے۔ مگر بنواری لعل یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا کہ لڑکا میٹرک پاس کر لے پھر دیکھا جائیگا۔

بالآخر سوہن میٹرک میں کامیاب ہو گیا۔ اب بنواری لعل کو بہانہ بنانا مشکل ہو گیا۔ اس لئے سوہن کی شادی چرنجی لعل کی اکلوتی لڑکی سے ہو گئی۔ چرنجی لعل امرتسر میں سونے کا کاروبار کرتے تھے۔ کام اچھا تھا۔ کافی جائداد تھی۔

سوہن پہلی بار اپنی بیوی کو لینے امرتسر آیا۔ پہلے

پہلے سسرال میں جتنی عزت جتنا مان ہوتا ہے۔ یہ شادی
 خدہ اصحاب بخوبی جانتے ہیں۔ سوہن کو مجبوراً ایک ہفتہ
 امرتسر رہنا پڑا۔ آخر آٹھویں دن وہ کراچی
 کی طرف روانہ ہونے کے لئے اسٹیشن پر آیا۔ بیوی
 کو تو ایک زمانہ کپا ڈمنٹ میں بٹھا دیا۔ اور آپ
 دو سکر ڈبے میں جا بیٹھا۔ گاڑی دو گھنٹہ لیرٹ
 تھی۔ یہاں دیر تک ٹھہرنے کی وجہ سے بھلا کو پیاس
 نے بہت تنگ کیا۔ ایک شوہر سے بالکل نا آشنا۔
 دوسرے حیا۔ دو بائیں تھیں۔ جو پیاس کو اور
 بھی تیز کر رہی تھیں۔ اور نہ ہی سوہن بھلا کو دوبار
 دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ شدت پیاس سے
 بھلا حیران ہو رہی تھی۔ سامنے نل تھا۔ مگر وہاں
 تک پہنچنا اُس کے لئے ناممکن ہو رہا تھا۔ شہر کی لڑکیاں
 لاکھ باخیا ہوں مگر پھر بھی آزاد ہوتی ہیں۔ بھلا سے
 نہ رہا گیا۔ وہ اٹھی اور نل کی طرف روانہ ہوئی
 ابھی نصف راستہ بھی طے نہ کیا تھا کہ انجن
 نے آخری دسل دی۔ اور روانہ ہو پڑا۔
 اس سے پہلے کہ بھلا پھر واپس ہوتی۔ گاڑی تیز

ہو چلی تھی۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ اتنی قریب
 ہوتے ہوئے بھی کتنی دور تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا
 تھا۔ آخر بیٹ فارم سے باہر نکلی تو اس کی
 نگاہ یعقوب پر پڑی۔ جو اپنا ٹانگہ لئے دروازے
 کے سامنے کھڑا تھا۔

”ٹانگہ خالی ہے؟“

”ہاں“

بملا ٹانگے میں بیٹھ گئی اور اُسے کچھری روڈ پر
 چلنے کے لئے کہا۔ ٹانگہ ہوا سے بائیں کرنے لگا۔
 شام کا وقت تھا۔ عالم پر تاریکی اپنا تسلط جما
 رہی تھی۔ یعقوب نے ایک بار مڑ کر بسا کی طرف
 دیکھا۔ وہ زبورات سے لدی ہوئی تھی۔ اُسے اس حال
 میں دیکھ کر یعقوب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ماضی
 کی تمام عیش و نشاط کی بائیں ایک ایک کر کے سامنے
 آنے لگیں۔ محوڑی دیر کے لئے دل میں ایک خیال نے
 چٹکی لی۔ اور پھر ایک دم ہی وہ خیال مضبوط ہو
 گیا۔

اب ٹانگہ بجائے کچھری کی سڑک کے رام باغ کی سڑک

پر دوڑ رہا تھا۔ بملا سوہن کے خیال میں مٹو مٹی۔
اُس کا تخیل ہوائی گھوڑے پر سوار نامعلوم کہاں
سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ دل سے باتیں کر رہی تھی۔ "کیا وہ اتنے ہی
لا پرواہ واقع ہوئے ہیں۔ کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی"
کیا میں امرتسر میں ہی رہ گئی ہوں۔" بلا کے تخیل نے ابھی
یہاں تک ہی پرواز کیا تھا۔ کہ ٹانگہ لگا۔ بملا چونک
پڑی اُسے اب معلوم ہوا کہ میسر ساتھ دھوکہ کیا
گیا ہے۔ میں اپنے خیالوں میں اتنی کھو گئی تھی۔ کہ
پتہ تک نہ لگا ٹانگہ کس طرف جا رہا ہے۔

بلا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔
چکرانے لگا۔ جسم بھرا اٹھا۔ ٹانگہ ایک ویران جگہ میں
کھڑا تھا۔ چاروں طرف موت سی خاموشی چھا رہی تھی
یعقوب نے کرخت مگر مدہم آواز میں کہا: "اگر
جان عزیز ہے۔ تو تمام زیور اتار کر۔ کہہ دو"

بملانے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ یعقوب کے ہاتھ میں
سات انچ لمبا چاقو چمک رہا تھا۔ وہ دہل گئی۔ ایک دفعہ
تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مرنا ایک بار ہے۔

مرنے سے پہلے اسے اپنے جسم کو ہاتھ تک نہ لگانے
 دوں گی۔ مگر موت کا خیال آتے ہی اس کا کلیجہ
 کانپا بھڑکھڑکھ سوچ کر۔ ایک ایک کر کے اپنے جسم سے
 تمام زیور اتار کر یعقوب کے اُگے رکھ دیا۔ یعقوب
 نے اٹھا کر انہیں اپنی اندرونی جیب میں رکھا۔ اور
 بسلا کو ٹانگے سے نیچے اتار خود جانے کے لئے تیار ہو گیا۔
 بسلا نے نہایت عاجزی سے کہا۔

مجھے کہاں جھوٹے جاتے ہو۔ کچھری روڈ تک

تو پہنچا دو۔

یعقوب نے جیسے سنا ہی نہیں۔ گھوڑے کو چابک سید
 کی اور چل پڑا۔ مگر چند قدم ہی گیا تھا۔ کہ ٹھہر گیا۔
 یکایک خدا معلوم اس کے دل میں کیا خیال پیدا ہوا
 کہ واپس ہو پڑا۔ اور بسلا سے مخاطب ہو کر بولا۔
 ”تمہارا بھی کام تمام کئے جاتا ہوں۔ شائد تم ہی
 میری اجل کی صورت اختیار نہ کرو۔ اگر تو زندہ بچ
 گئی۔ تو میں دنیا میں کسی کام کا نہ رہونگا۔“

پھر اپنے سر کی پگڑی اتار کر ہاتھ پاؤں باندھے اور
 چاقو اوپر اٹھایا۔ مگر بسلا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس

کا دل رز اٹھا - بدن میں برقی لہر دوڑ گئی - ہاتھ
 کانپے - پاؤں ڈگمگائے - چاقو ایک پانی کے گڑھے
 میں جاگرا - اس کے دل میں نیکی اور بدی میں جنگ
 ہو رہی تھی - نیکی اس گنہ عظیم سے روکتی تھی -
 مگر بدی کہتی تھی - اگر یہ زندہ بچ گئی - تو تم صبح
 پھانسی کے تختے پر ہو گے - آخر بدی نیکی پر غالب
 آئی - یعقوب چاقو نکالنے کیلئے پانی میں داخل ہوا
 مگر اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا -
 کیونکہ پانی میں سانپ کندلی مارے بیٹھا تھا -
 جس نے یعقوب کے پاؤں میں خوب کس کر گرہ
 باندھ لی - جس کی وجہ سے یعقوب کو پانی سے نکلنا
 دشوار ہو گیا - کسی نے سچ کہا ہے - مارنے والے سے
 بچانے والا زبردست ہے -

ایک طرف تو یعقوب کو سانپ نے پکڑ رکھا ہے -
 اور دوسری طرف بملا پکڑی سے جکڑی پڑی ہے -
 جاگوراکھے سانپاں - مارنے سکے کو
 بال نہ بیگا کر سکے - جا جگ - بیسری ہو
 لالہ دھنی رام عارف تھے - روزانہ رام تملائی پر جا کر

اشٹان کر کے سندھیا پوجا کرنا ان کا معمول تھا۔ شہر والے ان عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے روزانہ پروگرام کے مطابق آج بھی رام تلالی کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر ابھی گھی منڈی کے دروازے سے باہر چند قدم ہی گئے تھے۔ کہ کسی کے رونے کی آواز سے ٹھہر گئے۔ انہوں نے آواز پر کان دیئے۔ تو ساتھ کے درختوں میں سے آواز آرہی تھی۔ وہ بڑھے۔ تو دیکھا کہ ایک نو عمر حسینہ جکڑی ہوئی درخت کے نیچے پڑی تھی۔ سامنی طرف ایک گڑھا تھا۔ جس میں بارش کا پانی پڑ کر جمع ہو گیا تھا۔ اُس میں ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ وہ حیران تھے کیا معاملہ ہے۔ ان کے دماغ کے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آگے بڑھے۔ اور دو شہزہ سے دریافت کیا۔

”دیوی کیا بات ہے؟ تم اس حالت میں کیوں

ہو؟“

”آپ میرے ہاتھ پاؤں کھول دیں۔ بھر تمام

واقعہ سناؤنگی۔“

دھنی رام نے بھلا کو آزاد کر دیا۔ اُس نے تمام داستان

شروع سے لے کر آخر تک گوش گزار کر دی۔ اتنے میں اور آدمی بھی اکٹھے ہو گئے۔ کیونکہ صبح ہو چکی تھی۔ اور لوگ آنے جانے شروع ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ خبر تمام شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دھنی رام نے جا کر پولیس میں اطلاع دی۔ انسپکٹر پولیس چند سپاہیوں کے ساتھ آ پہنچے۔ بلا کا بھائی بھی پہنچ گیا۔ آخر یعقوب کو پانی سے باہر نکالا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ اُس کے پاؤں سانپ نے جکڑ رکھے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھا تو سانپ مردہ تھا۔ لوگ حیران رہ گئے۔ قدرت کی رہبات میں راز ہے۔ اس واقع کے ایک ماہ بعد یعقوب کے عمر کالے پانی کی سزا ہوئی۔

۵۰ بیسویں سچا واقعہ

سوسائٹی کی پھینٹ

(۱)

کنلا کے آیام لڑکپن کی شوخی و معصومیت ختم ہو
 چکی تھی — اس کی جگہ پڑجوش اور مسرت خیز شباب
 برساتی نالے کی مانند ٹھٹھٹیں مار رہا تھا — وہ
 حسین تھی — ماہ کا بل کی طرح — اس کے
 سینے میں اُستگوں کا دریا موجزن تھا۔

مگروہ منزل پر پہنچا ہوا — دور دراز کا سفر طے کر کے
 — ٹھٹھا ماندہ — ایک مسافر تھا۔ جس کا
 ہر عضو ناکارہ ہو چکا تھا — اس کی زندگی چراغِ سحری
 کی مانند تھی۔

ایک کی زندگی کی صبحِ دلکش تھی۔ اور تمناؤں کا
 آفتاب پورے جوش سے طلوع ہو رہا تھا۔ مگروہ سے

کی زندگی کی قیامت نیز شام — جس کی ظلمت میں جسم کی
بوسیدگی کے ساتھ اُردوئیں بھی غرق ہو رہی تھیں -
اُن دونوں میں کتنا اختلاف تھا — !

کھلا کے باپ کی آنکھیں تو دولت کی چمک سے اندرھی
ہو گئی تھیں۔ لیکن سوسائٹی! — اس نے بھی سب کچھ
دیکھا تھا۔ سمجھا۔ مگر پھر بھی کھلا کو اس لقمہ اجل کی موت
کے ساتھ وابستہ ہونے دیا۔

صبح دلکش شپ دیکھو۔ سے نعل گیر ہو گئی۔ عالم نے چُپ
چاپ دیکھا۔ لب تک دانہ کئے

(۲)

اگلے دن

غام کا وقت کھا۔ کھلا دریا کے کنارے بکھرے خیالات میں
متفرق بیٹھی تھی۔ پلٹ پر گیسوئے خمدار ہوا کے مشک ہاتھوں
سے لہرا رہے تھے۔ — جوٹ کھائے ہوئے ناگوں کی
طرح -

وہ غائب میں جھانکنے کی ناکام سعی کر رہی تھی۔ اُس
کا دل کسی نامعلوم خطرے کو محسوس کر کے دھڑک رہا تھا۔
وہ اپنے دل کی حرکت کے ساتھ ساتھ قیامت کی خوفناک گرج

بہترین الفاظ اور خیال کے موتی تصور کے سمندر سے
جمع کر رہی تھی۔

’ میں الوداع کہنے آیا ہوں۔‘

’ الوداع! نہیں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلو۔‘

’ ایسا نہ کہو۔ کھلا۔ تم اب بیگانی ہو۔۔۔ نئی ماضی کو بھول
جاؤ۔ اُس کے تصور تک کو آئینہ دل سے مٹا ڈالو۔ کھلا! سچ
تو یہ ہے۔ مجھے انسانوں سے کچھ نفرت ہو گئی ہے۔ میں
اب وہاں جا رہا ہوں۔ جہاں انسان کا نام تک نہ پاسکوں جس
جگہ موت کی سی خاموشی کا تسلط ہو۔‘

’ مجھے بھی وہاں لے چلو نا۔‘ کھلا نے مرلی کے دامن کو
جھنجھورتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے عاجزی کی جھلک
جھلک رہی تھی۔

’ کھلا! مجھے گناہ کا شریک کار نہ بناؤ۔ تم بیگانی ہو۔ کچھ
سوچو تو سہی۔‘

’ نہیں۔ میں بیگانی نہیں ہوں۔ تمہاری تھی۔ تمہاری
ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔ میں اپنا سب کچھ کبھی کا
تمہاری نظر کر چکی ہوں۔‘

اس کے الفاظ میں نرمی تھی۔ لیکن اس کا لہجہ بتدریج

سخت ہو رہا تھا۔

’اگر اس ظالم سوسائٹی نے تمہاری امانت کسی دوسرے کے حوالے کر دی ہے تو تم سوسائٹی سے لڑو۔ اس کے دشمن بن جاؤ۔ اپنی چیز کے لئے۔ فقط اپنے حق کے لئے۔‘

کلا کی آواز شدت جو سن سے کانپ رہی تھی :
مرلی نے سنان سنا کر دیا۔ وہ آخری فیصلہ کر کے آیا تھا۔ اس واسطے اس نے کوئی ترمیم منظور نہ کی۔ وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ اگر میں مھوڑی دیر اور یہاں کھڑا تو میرا ریت کی دیوار ثابت ہوگا۔

’الوداع‘ اس نے نظریں زمین پر گاڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں کمزوری تھی۔ لیکن دن چٹان کی مانند مضبوط۔ اس نے جواب تک کی پرواہ نہ کی۔ اور قدم اکٹھا دیئے۔

کلا کے ہاتھ اس کو روکنے کیلئے اٹھے۔ لیکن کچھ سوچ کر وہیں کے وہیں رہ گئے۔ اس نے اس کو جانے دیا۔ کلا کی نظریں مرلی کی پیٹھ پر جم رہی تھیں۔ جو لمحہ بے لمحہ دُور بہت دُور ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ حرکت

رہے تھے۔ اس کا دل و دماغ سوسائٹی کے خلاف زہر
اُگل رہے تھے۔ اس کے ہونٹ ان الفاظ کو بے روک
ٹوک باہر پھینک رہے تھے۔ لیکن سسے بے
آواز سسے کیوں کہ انتہائی غم و غصہ نے زبان
کو بے حس کر رکھا تھا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ کلا چونک پڑی۔
خار آلود آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا سسے
بوڑھا تھا سسے سوسائٹی کا منتخب خاوند!

کلا کی حالت و گرگوں ہو گئی۔ بال بال لرز اٹھا۔ دل
زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا زخم خوردہ دل مایوس
کی غیر برداشت چوٹوں سے گھائل ہو چکا تھا۔ اُس
نے ایک سرد آہ بھری اور اضطرابی کی حالت میں اٹھ
کر بیٹھ گئی۔ وہ حسرت بھری لگا ہوں سے کلا کی
طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر کلا اپنے آپ
کو سمیٹتی ہوئی پلنگ کے آخری کونے میں دبکی جا رہی
تھی۔ اُس کی آنکھوں میں معصومیت کی جھلک رونما تھی۔
دل پر دہشت طاری تھی۔ بوڑھے نے منزل پر پہنچ کر کلا
کو چھوٹا۔ کلا کا دل بے قابو ہو گیا۔ صبر کا پیمانہ نہریز

ہوا اور چھلک گیا۔ وہ سانپ کی طرح ہنکارتی ہوئی اٹھ کر کھڑکی کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

”ہران پیاری؟ بوڑھے نے اپنا وقار غالب کرنے کے لئے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

کلا نہایت غیض و غضب سے خونباز آنکھوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھتے ہوئے گرفت آواز میں بولی۔ بس ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنا۔ کلا کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔

خفا کیوں ہوتی ہو؟ اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔
 کلا کھڑکی سے کوڈ پڑی۔ وہ خاموش پتھر کے بت کی طرح اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔

سکنا

جگمگاتے ہوئے ستاروں میں بڑا حیران ہوں - تم عالم سے
اسے بلند، سیرے کی مانند آسمان میں کیا چیز ہو - جب سورج
عزوب ہو جاتا ہے - اور وہ کسی چیز پر اپنی کرنیں نہیں ڈال سکتا
تب تم اپنی ننھی سی روشنی دکھاتے ہو اور تمام رات جھلس جھلس
کرتے ہو -

شب ظلمت میں مسافر تمہاری ہی چھوٹی سی چنگاری جیسی روشنی کا
شکر یہ ادا کرتے ہیں - اگر تم اس طرح نہ چمکتے تو وہ اپنا راستہ کس طرح تلاش
کرتے - تم نیلگوں آسمان میں قیام پندرہ ہو - اور اکثر میرے پردوں میں
بھانسا کرتے ہو - کیونکہ جب تک سورج نہیں نکلتا - تم اپنی منوہ
آنکھیں بند نہیں کرتے -

تمہاری چھوٹی مٹی جگمگاتے اور ننھی چنگاری اندھیری رات میں لہکروں کی رہنمائی
کرتی ہے - اگرچہ میں نہیں جانتا کہ تم کیا چیز ہو - تاہم
ننھے ستارو تم جگمگ جگمگ کرو -

(جیم ٹایٹر)

بیوہ کا چراغِ حیات

لا

شوشیلا ادھیڑا عمر کی عورت تھی۔ اس کے حسن و اخلاق نے محمد والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کے پتی دیو دو سال ہوئے اس جہانِ فانی سے۔ راہی ملکِ عدم ہو گئے تھے۔ شوشیلا کی زندگی ان کے بغیر اس چراغ کی مانند تھی۔ جس میں تیل نہ ہو۔

لیکن قدرت نے بچے کو مقناطیس بنا دیا ہے۔ جس کی محبت کی کشش سے ماں خود بخود کبھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جان اس کے معمول سے دکھ کے بدلے دینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ بچے پر ننھی سی مصیبت آئی ہوئی ماں کا کلیجہ مسل کر رکھ دیتی ہے۔ وہ اپنی ہستی کو بھول کر مصیبت کے دشتناک طوفان خیز سندر میں کود پڑتی ہے۔ جس کے ننھے سے بے لوث دل کی ننھی سی برافروختگی کے سامنے دنیا کا جاہِ جلال بیچ ہے۔ اس کی ضد کے آگے شہنشاہ کا تاج و تخت کوئی نمایاں حقیقت نہیں رکھتا۔ بعینہ شوشیلا کا ٹٹماتا ہوا

چراغِ زندگی بھی موہن — اُس کے لختِ جگر —
 اس کی تمام عمر کی کمائی — کی منیا سے پُر
 نور تھا۔

شوخیلا - موہن! اور صرف موہن کی محبت میں
 بے خود رہتی تھی۔ مگر آسمان سے ستارے ٹوٹتے
 اور جن اٹھنے دیکھنے اُسے منظور نہ تھے۔ موہن
 بیمار ہو گیا۔

(۱۷)

شوخیلا جو اکثر نان جو میں تک کی محتاج رہتی تھی۔
 ڈاکٹر کا خرچ کس طرح برداشت کرتی۔ بیچاری مات
 کی ماری حکیموں کے پیچھے دیوانہ وار پھرتی۔ جو کچھ
 کسی نے کہا۔ اُس نے کیا۔ مندروں میں جا کر منٹیں مانگی۔
 گھنٹوں دیوی کے پاؤں سے اپنی پیشانی کو رگڑا۔ مگر
 جو الیشور کو منظور تھا وہی اُٹوا۔ موہن کی حالت
 بدتر سے بدتر ہوتی گئی۔ جتنے کہ جو تھے دن شوخیلا
 کی امیدوں اور آرزوں کا یہ چراغ بھی گل ہو گیا۔
 شوخیلا کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اُس کی چیخ و پکار
 سے محلے بھر میں کہرام مچ گیا۔ محلہ والے دلی ہمدردی

سے اُس کے غم میں شریک تھے۔ مگر قدرت کے
 اُہنی گرفت کا مقابلہ کرنا انسانی طاقت سے بعید
 ہے۔ بہیروں نے اُس کو تسلی دینے کی کوشش کی
 لیکن بے سود۔

۳

اب اُس کے آنسو نہ رکنے والی ندی کی شکل اختیار
 کر چکے تھے۔ شوشیلا دیوانی ہو گئی۔ سارا سارا دن
 موہن۔ موہن کی رٹ لگائے شہر میں گھوما کرتی۔ کسی
 سے پوچھتی۔ کیا میرا موہن دیکھا؟ لڑکوں سے دریافت
 کرتی۔ ”کیا موہن سکول گیا تھا؟“ وہ اکثر شمشان میں
 جاتی۔ گھنٹوں موہن کی چٹا پر بیٹھی رہتی۔ راکھ کو
 بو سے دیتی۔ آنکھوں سے لگاتی۔ اس کی دل سوز
 آہ و بکا سے مرگھٹ کی دیواریں — پتھر دل
 دیواریں بھی — جنہوں نے اس طرح کے
 لاکھوں واقعات دیکھے تھے۔ گانپ اٹھتی تھیں۔ اب
 شوشیلا کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ صرف دل
 کی آگ میں جل کر خشک ہو چکے تھے۔ لوگ اُس کی
 طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور آہ بھر کر

چپ ہو جائے۔

ایک دن شو شینا حسب معمول مرگھٹ میں گئی۔ مگر
 خلاف معمول اُس کو ایک بہانے کے درشن ہوئے۔
 اس تیسویں بیچ نے شو شینا کو سب کچھ بھلا دیا۔ وہ
 لوہے کی طرح کبھی ہونی کسی مقناطیسی اثر سے سادھو
 کے پاس گئی۔ اور اُس کے قدموں پر اپنا
 سر رکھ دیا۔ سادھو نے اُسے اٹھایا۔ اور گھنٹوں
 نامعلوم کیا اپدیش کرتا رہا

•••

اُس روز کے بعد شو شینا وہ پہلی شو شینا نہ تھی۔
 اُس کے پشردہ پہرے پر وحشت کی بجائے خوشی اور
 غمگین اور خشک آنکھوں میں نور اور نئی کی جھلک نمایاں
 ہو گئی تھی۔ اُس کے معمول میں بھی حیرت انگیز انقلاب
 واقع ہو گیا۔ وہ صبح اٹھتی۔ اپنے ہاتھ میں سفید چاک
 لیتی اور ہر دیوار پر دُنیا فانی ہے " یہ الفاظ لکھ دیتی۔ وہ
 عموماً خاموش رہتی۔ مگر جب کبھی زبان کھولتی تو
 "دُنیا فانی ہے" کی گونج سنائی دیتی۔

—————

ایثارِ الفت

(۱)

ایک غمناک دن کی شام کو انگلستان کا آفتاب اپنے حلقہ کے علاقہ کو دریائے خوبصورتی میں غرق کرتا ہوا دھوپھاٹ یوں پر غروب ہو رہا تھا۔ اس کی الوداعی رو پہلی کرنیں ایک نوجوان اور ایک حسینہ کے رخ روشن پر پڑ کر آنکھ مچولی کھیں رہی تھیں۔ نوجوان تھکاوٹ سے نڈھال تھا۔ اس کی شگن آلود اور عرق ریز پیشانی جھکی ہوئی تھی۔ حسینہ کی پریشان زلفیں باد صبر کے مشک بارجموں

میں لہرا رہی تھیں۔ اُس کے لبوں کی رنگت شدت
خون سے کاغذ کی مانند سفید تھی۔ دونوں ہتھے
ہوئے ایک دوسرے سے چٹ رہے تھے۔ حسینہ
لبوں پر آئے ہوئے لفظوں کو روکنے کی فضول
سعی کر رہی تھی۔

گھنٹہ آج رات بجنا نہ چاہیے۔

(۶)

”سیکٹن!۔“

بہسی کے سفید ہونٹ جیل کی سیاہ چار دیواری
اور بھیانک پھاٹک کی طرف نگاہ جاتے ہی لرز کر
رہ گئے۔ آواز گلے میں آکر رک گئی۔ اُس نے دل
پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرد آہ بھری۔ پھر خود سے
کہا۔

میرا پیارا شوہر اس زنداں میں مقید ہے۔ اور
آج رات گھنٹہ بجنے پر نذر اجل کیا جاوے گا۔
آہ! مجھے کسی سے امداد کی توقع نہیں۔ اور شاہ کروم دیل
بھی عذوب آفتاب سے پیشتر نہ آسکیں گے۔

اس دہشت نیز خیال کے آتے ہی حسینہ کے چہرے پر

ہوئیاں اڑنے لگیں۔ یا قوتی، مونوں پر حسرت ناک
سفیدی نے قبضہ کر لیا۔ رخساروں کی رنگت زرد
پڑ گئی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"گھنٹہ آج رات نہ بچنا چاہیے۔"

(۳۱)

آفتاب لمحہ بہ لمحہ اپنی تاریک خواب گاہ کی طرف
قدم بڑھا رہا تھا۔ بوڑھا سیکنڈ اپنی مختصر کوٹھڑی کی
چوکھٹ پر بیٹھا ہوا خود بخود کسی جتنی جوش کے زیر اثر
بڑبڑا رہا تھا۔

اس اوداس اور تاریک مینار میں بس نے کئی
سال گھنٹہ بجایا ہے۔ ہر شام کو سورج غروب ہو جانے
کے بعد۔ جب کہ نیلے آسمان پر سفیر ستارے ٹٹا رہے
ہوں۔ بس نے اپنا فرض مقررہ وقت پر
ایمان داری سے ادا کیا ہے۔ بیشک اس وقت ماضی
کی وہ رنگینیاں ہی نہیں — نوجوانی کے ایام
دھندلا سا خواب رہ گئے ہیں — جسم کی تمام
قوتیں ایک ایک کر کے جواب دے چکی ہیں — کیا
ہذا؟ اس پر بھی اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کر

سکنا!
 رگھنیا آج رات ضرور بچے گا۔

(۴)

بیسویں کا بال بال لرز رہا تھا۔ چشم پُر نم تھے۔ چہرہ
 نرد تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ اور پیشانی پر فکر و تشویش
 سے شکن پڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے خوف زدہ اور
 بیخبل دل میں ایک عہد کیا۔ اور ساتھ ہی اُس کی
 آنکھوں کے سامنے دو خوفناک نظارہ سینما کی ہتھک
 تصاویر کی طرح پھر گیا۔ جب جیوری نے سنگ دلی
 سے بغیر آنسو بہائے یا سرد آہ بھرے حکم ستایا
 تھا۔

رگھنیا کے بچنے پر بیس انڈوڈ کو پھانسی کے تختے
 پر چڑھا دیا جاوے!

اب اُس کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ آنکھوں سے
 اشکوں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ اس کی زبان سے محراتے
 ہوئے الفاظ نکلے۔

”گھنیا آج رات نابھنا چاہیے۔“

(۱۵)

حسینہ جو روں کی طرح دبے پاؤں شب کی ظلمت میں
 آگے بڑھی - اور گرجے کے بوسیدہ پھاٹک پر
 پہنچی - مگر وہاں ٹھہری نہیں - اُس کا دل ریش سیلاب
 تھا - لیکن استقلال قائم — وہ گرد آلود زینے
 پر جہاں کئی سالوں سے بنی نوع انسان کے قدم
 نہ پہنچے تھے - اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے
 چڑھنے لگی - ہر جانب دہشت خیز سناٹا اور خوفناک
 تاریکی کا تسلط تھا - ایک چمکا دڑ اس کے پاس سے
 پھڑ پھڑاتا ہوا نکل گیا - اس کے روٹھے کھڑے
 ہو گئے - دل کی دھڑکن میں اضافہ پر اضافہ ہوا -
 قدم ڈکھلا گئے - چٹان ایسا مضبوط استقلال قائم نہ
 رہ سکا — وہ واپس ہونا چاہتی تھی - کہ دل کی
 دھڑکن سے آواز پیدا ہوئی -
 دگنٹہ آج رات بچنا چاہیے !!

۶

وہ آخری زینے پر پہنچ چکی تھی - اُس کے سر پر سیاہ
 دیوہیکل گنٹہ لٹک رہا تھا -

”گھنٹہ بجنے کا وقت قریب تر ہے“ — اس خیال کے فہم میں آتے ہی اس کی سانس رُک گئی۔ چہرہ فق ہو گیا۔ کئی قسم کے برے خیال دل و دماغ میں پناہ گزیں ہو گئے۔

”کیا میں گھنٹے کو بجنے دوں گی؟“ — نہیں!

”کبھی نہیں!!“ —

اس فوری خیال کے آتے ہی وہ مضبوطی سے گھنٹے کے موصل کے ساتھ چمٹ گئی۔ اس کے لب آہستہ آہستہ وا ہوئے۔ پھر انہوں میں جنبش آئی۔

”گھنٹہ آج رات نہیں بجے گا۔“

(۷)

بوڑھے اور بہرے سیملٹن نے گھنٹے کے رستے کو اپنی تمام قوت سے ہلانا شروع کیا۔ اس نے گھنٹہ بجنے کی آواز نہیں سنی۔ لیکن اس کا خیال تھا گھنٹہ بچ رہا ہے۔

اُدھر نو جوان بیس کے سپرد خاک کرنے کا سامان بالکل تیار تھا — حسینہ ابھی تک موصل سے لٹکی ہوئی تھی۔ دل کی دھڑکن کو روکنے کی سعی کرتے ہوئے

اُس نے لرزتی ہو آواز میں کہا -
 "گھنٹہ آج رات نہیں بجے گا۔"

سب تمام ہو چکا تھا۔ گھنٹہ کی حرکت بند ہو چکی
 تھی۔ حسینہ نے ایک دفعہ کا پتی ہوئی خوف زدہ
 نگاہ گھنٹے پر ڈالی۔ پھر گرد آلود زمین پر واپسی
 قدم رکھا۔۔۔ جو کچھ اُس رات اُس نازک اندام
 حسینہ نے کیا۔ وہ روزِ روشن کی طرح منور
 رہے گا۔

"گھنٹہ اُس رات نہیں بجے گا۔"

(۹)

دور پہاڑیوں پر سے آتی ہوئی بینڈ کی شیریں آواز
 نے بتایا کہ شاہِ کروم وین آرہے ہیں۔ حسینہ کی دُک
 رگ میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ چہرہ سُٹھا اُٹھا۔
 آنکھیں مسرت سے اٹکیا رہو گئیں۔

اُس نے شاہِ کروم وین کے سامنے دو زانو ہو کر
 اپنی داستانِ الم سنائی۔ اور اپنے لہو لہان ہاتھ
 دکھائے۔ ابھی تک اُسکا خوف و حراس بالکل دور نہ ہوا

مقا -

شاہ کروم ویں نے اُس کے سر پر سفت امیز ہاتھ پھرتے ہوئے کہا " تمہارا خاوند زندہ ہے ۔

اس دل خو شکن خبر سننے ہی بیسی کے تمام جسم میں مُرت کی برقی لہر دوڑ گئی ۔ چہرے پر تسکین اور خوشی کے آثار ہو پیدا ہو گئے ۔ آنکھوں میں خاص چمک پیدا ہو گئی ۔ اس نے شکریہ کے طور پر اپنا سر جھٹکا دیا ۔

”گھنٹہ آج رات نہیں بجا“

شاہ کروم ویں کی آواز فضا میں غائب ہو گئی ۔

(انگریزی)

پرفریب ہوکا

(۱)

گاڑی علی گڑھ کے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ لوگ سوار ہونے کے لئے سڑک سے کام لے رہے تھے۔ ایک ڈبے کا ہمارا لئے ڈاکٹر محمود کسی گہرے خیال میں مشغول چپ چاپ کھڑا سیگٹ کے بادل آسمان کی طرف اڑا رہا تھا۔ رام پور کے نواب صاحب نے اپنی صحت درست کرنے کے لئے کلکتہ کے راستے دارجیلنگ جانا تھا۔ محمود ان کے خانگی ڈاکٹر تھے۔ اور اب اسٹیشن تک انہیں رخصت کرنے کے لئے آیا تھا۔ نواب صاحب کو آرام سے گدیے پر

نگاہیں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

واہ ڈاکٹر صاحب! یہ بھی آپ نے خوب کہی۔ وہ موتی مجھ سے کبھی جہا نہیں ہو سکتا۔ یہ دیکھئے وہ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔

ان لفظوں کے ساتھ ہی نواب صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چمکتا ہوا موتی نکال کر ہاتھ پر رکھ لیا۔ موتی کی بڑی نور ضیا سے کمرہ میں روشنی ہو گئی۔ موتی کو دیکھ کر ایک بار ڈاکٹر کی آنکھیں چمک اٹھیں دل میں شعاع امید نمودار ہوئی۔ دو چار ادھر ادھر کی اور باتیں کر کے ڈاکٹر نے نواب صاحب کو سلام کیا اور اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

(۳)

شب ظلمت! گیارہ بجے کا عمل۔ ایک موٹر نہایت تیزی سے علی گڑھ ٹونڈلا روڈ پر جا رہی ہے۔ وہیلان اور سنسان سڑک پر۔ صرف روشنی کی ایک لکیر نظر آتی ہے۔ جو اس موٹر کے لمبوں سے نکل رہی ہے۔ اس کے سوا دور تک کوئی اور روشنی نہیں۔ موٹر میں صرف ایک آدمی بیٹھا ہے۔ جو ڈرائیور کی ڈیوٹی ادا کر رہا ہے۔ اُس نے

موٹر مکمل رفتار پر چھوڑی ہوئی ہے۔ موٹر کے ہینڈل پر
دائیاں ہاتھ رکھے وہ وکسی خوفناک خیال میں غرق ہے۔
ساتھ ہی کچھ بڑبڑاتا جاتا ہے۔

امید ہے۔ ٹونڈلا پر ٹھیک پہنچوں گا۔ موٹر۔
بالکل موزوں ہے۔۔۔ جھاڑیوں میں۔۔۔ پھر ٹکٹ۔
کانپور کا۔۔۔ موتی جیب میں ہی ہے۔۔۔ واپس۔
نسی بر۔ گھر۔

اس کی انہیں باتوں میں ٹونڈلا اسٹیشن کے لمپ نظر
آنے لگے۔ اس نے اسٹیشن کے لمپ نظر آنے لگے۔ اس
نے اسٹیشن سے چند قدم کے فاصلے پر موٹر روکی۔
اور سڑک سے قدرے ہٹ کر جھاڑیوں کے جھنڈ کے پیچھے
کھڑی کر دی۔ پھر ایک ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیا اور
پیدل ہی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اس وقت
ایک مولوی کے بھیس میں تھا۔ منہ پر لمبی ڈاڑھی بڑی
بڑی موچھیں۔ نکلے میں گھٹنوں تک کوٹ۔ ٹانگوں میں بہت
چوڑا پاجاما۔

وقت پر گاڑی آئی اور وہ آدمی خلق کی نظر سے بچتا
ہو کر ایک فرٹ کلاس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ

نواب صاحب کا مٹھا - جو اس وقت عالم سے بے خبر با آرام
 سو رہے تھے - اُس آدمی نے اندر داخل ہو کر پہلے
 تو نواب صاحب کی طرف دیکھا پھر ایک بار باہر
 کی طرف دیکھا - بعد میں کوٹ کی اندرونی جیب
 سے ایک لبا چاقو نکالا جس پر ذیل کی عبارت سنہری
 لفظوں میں کندسی تھی -

د نواب رام پور کی طرف سے

ڈاکٹر محمود کو بطور تحفہ

ڈاکٹر نے ایک لمحہ کچھ سوچا - اس وقت اُس کی آنکھوں
 میں دہشت انگیز چمک تھی - آہستہ آہستہ اُس کا
 ہاتھ اوپر اٹھنا شروع ہوا - اور اس کے بعد چشم زدن
 میں نواب صاحب کی گردن میں داخل ہو گیا -

”ہائے — ظالم! صرف دو لفظ نواب صاحب کی
 لرنٹی ہوئی زبان اور روندے ہوئے گلے سے نکلے اس
 کے بعد روح ہوا میں پرواز کر گئی -

ڈاکٹر نے نواب صاحب کی جیب میں ہاتھ ڈالا - اور
 موٹی نکال کر لہجائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا دیکھتے
 ہی اُس کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی - پھر

موتی جیب میں ڈال لیا۔ ایک رومال نکال کر اپنے ہاتھ صاف کئے۔ اپنی ڈاڑھی۔ مونچھ۔ لمبا کوٹ اور جوڑا پاجامہ اُتار ڈالا۔

کوٹ اور پاجامہ اتارتے ہی اس کی شخصیت میں نمایاں فرق پڑ گیا۔ اُس نے ہینڈ بیگ سے انگریزی ٹوپی نکال کر پہن لی۔ اب وہ بالکل انگو اندرین تھا۔ اُس نے خون سے بھرے ہوئے کپڑے اور جاقو اس خالی بیگ میں بند کیا اور پچھلی طرف سے ہوتا ہوا اپنی موٹر کے پاس آ گیا۔

یہ تمام کام کچھ اتنی تیزی سے کئے گئے تھے۔ کہ ابھی گاڑی کی روانگی میں چند منٹ باقی تھے، جب اس نے اپنی موٹر سڑک پر لا کر کھڑی کر دی۔ بیگ موٹر میں رکھا اور موٹر چل پڑی۔۔۔ چند سیکنڈ کے بعد موٹر ایک دریا کے پل پر کھڑی تھی۔ اُس نے موٹر سے سر نکالا چاروں طرف سناٹا دیکھا۔ صرف ندی کے بہاؤ کی شاں شمال کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ندی کی چھاتی پر نینگوں آسمان اور ستاروں کا عکس رقص کر رہا تھا۔ اُس نے بیگ ہاتھ میں اٹھایا۔ اس کے بعد دریا

کی شاں شاں میں ایک ہب آواز پیدا ہوئی اور بس -
اب موٹر پھر تیزی کے ساتھ علی گڑھ کی طرف جا
رہی تھی۔

(۳)

علی گڑھ میں کوچہ شہر جنگ کے اندر ایک جوہری کی
دکان تھی۔ علی گڑھ کے گرد و نواح میں یہ تھی چوریاں ہوتی
تھیں۔ ان سب کے مال کی کھپت یہی ہوتی تھی۔
دکان کے مالک لالہ مانگ چند واقع ہی مانگ چند تھے۔
کیا مجال جو کوئی آنکھوں میں دھول ڈال جائے۔ انہیں
کھرے کھوٹے کی خوب پہچان تھی۔ ایک آنکھ دیکھتے
ہی پہچان لیتے تھے۔ کہ یہ نکل ہے یا اصل۔
دوسرے دن شام کو ڈاکٹر محمود مانگ چند کی دکان
پر پہنچا۔ اور موتی نکال کر جوہری صاحب کے ہاتھ پر
رکھتے ہوئے بولا۔ لالہ جی دیکھئے کس قیمت کا مال ہے؟
لالہ نے موتی دیکھا۔ آنکھیں لال ہو گئیں۔ بولے۔ واہ
ڈاکٹر صاحب دھوکہ مجھ سے ہی کرنا تھا۔ ایک کاغذ
کے ٹکڑے کو موتی ظاہر کرنا یہ اُدھیت میں داخل
نہیں۔

”کانچ کا ٹکڑا“

ڈاکٹر نے حیرت خیز نگاہوں سے موتی کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔

”ہاں کانچ کا ٹکڑا“ اس کی قیمت ایک معمولی کانچ کے
ٹکڑے سے زیادہ نہیں۔ جو ہری نے اپنی بات پر زور دینے
ہوئے کہا۔

”پھر دیکھ لیجئے۔ شائد۔“

معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب آپ کو کسی نے دھوکہ دیا
ہے۔ یہ تو نقلی موتی ہے۔ ہاں اس کے بتانے والا ایک قابل
استاد اور تعریف کے لائق آدمی ہے۔

ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے موتی اٹھالیا۔

(۴)

دوسرے دن کے اخبار نواب صاحب کے قتل کی
خبر سے بھرے پڑے تھے۔ پولیس نے قاتل کو بہت تلاش
کیا۔ لیکن ناکام رہی۔ نواب صاحب کا وصیت نامہ کھولا
گیا۔ انہوں نے وہی موتی ڈاکٹر کو نذرانہ پیش کیا تھا۔
ڈاکٹر کے دوست پھولے نہ سمائے۔ کچھ ایک جھاگے جھاگے

ڈاکٹر کے گھر پہنچے۔

وہ! بھائی! ڈاکٹر مبارک ہو۔

آخر ڈاکٹر نے تنگ آکر پوچھا۔ مبارک کی کیا بات

ہے؟
پوچھتے کیا ہو؟ نواب صاحب تمہیں اپنا موتی دے

گئے ہیں؟

موتی۔ موتی کیسا؟

ہاں! ہاں! موتی وہی خاندانی؟

کیوں تنگ کرتے ہو کہاں دے گئے ہیں؟

اُس چاقو کے دستے میں جو انہوں نے آپ کو پکھلے

سال تحفہ دیا تھا؟

یہ کہتے ہوئے اخبار نکال کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں

دے دیا۔

ڈاکٹر چونک اٹھا۔

چاقو کے دستے میں — موتی؟

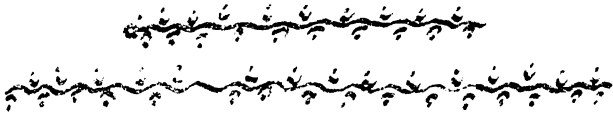
ہاں! ہاں!! چاقو کے دستے میں موتی۔ یار۔

سٹھائی!

پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی

ڈاکٹر پر گھڑوں پانی پڑ گیا پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"ہائے اچاقو۔۔ بیگ میں۔ دریا کی لہروں سے ہم آغوش
 — ڈاکڑ نے سر پکڑ لیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے
 اندھیرا چھا گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی دوزخ
 کی آگ میں گھسیٹ رہا ہے۔"



مطلبی دنیا

”یہ کیا ہے؟“

”کسا ہے؟“

”کس لئے؟“

”درہنے دو! کیوں پوچھتے ہو؟“

”اور یہ لمبی چھٹری کیسی ہے؟“

”یہ — — ناٹھی ہے!“

”کیوں کسی کو مارنے کے لئے؟“

”نہیں — —“

”یہ سر پر کیا ہے؟ اور کمر میں یہ پھٹا ہوا — —“

”میلنا پھیلا کپڑا کیسا؟“

”ابھی یہ تو پگڑی ہے۔ صرف دو گنز بھٹی ہوئی۔ اور سی ہوئی۔“

”اور یہ — — دھوتی — —“

”نمبر راگسر کہاں ہے؟“

”جہاں پڑا رہوں“
 ”تمہارا کوئی رشتہ دار بھی ہے؟“
 ”نہتے لیکن اب نہیں“
 ”وہ کہاں گئے؟“
 ”کہیں بھی نہیں“
 ”کسی عجیب بات کرتے ہو۔ کیا وہ تم سے ناراض ہو
 گئے؟“

”نہیں مگر قدرت ناراض ہو گئی ہے۔“
 ”یعنی؟“
 ”قدرت کا چکر۔ جو وہ لوگ مسزہیں میں عزیز ہوں۔ دنیا میں
 کوئی کسی کا نہیں۔“
 ”کام کیا کرتے ہو؟“
 ”گھر گھر پھرتا ہوں۔ در در دھکے کھاتا ہوں۔ گلابیں
 سنتا ہوں۔ اتنا ہونے پر بھی کچھ
 کام

ہاں! ہاں! بتاؤ کیا کام کرتے ہو؟“
 ”نہ پوچھو! کچھ نہ پوچھو! بہت ذلیل کام ہے۔
 بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔“

”کیوں کوئی ایسا ہی نیچ کام ہے۔ چوری کرتے ہو ہ ڈاکہ
ڈالتے ہو؟“

”نہیں“

”کیا بخواری ہو؟“

”نہیں بھائی۔ دولت ہی کہاں جس سے جو اکھیلا جا
سکے“

”تو پھر کیا کرتے ہو خاک؟“

”میں بھیک مانگتا ہوں“

”تو تم بھکاری ہو؟“

”ہاں“

پھول اور سورج

کلی تب تک معصوم ہے۔ جب تک شگفتہ نہیں ہوتی۔ کلی چاہے
 کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو وہ کلی ہی ہے۔ اور معصوم ہے۔ اور
 جب کھل پڑے پھر پھول۔ معصومیت ختم ہو گئی۔
 کلی تب تک نہیں کھلتی جب تک سورج کی تپش اُس سے جکنا نہیں
 ہوئی۔ لیکن جب بادِ صحر میں ٹھنڈک نہیں رہتی اور وہ گرمی
 محسوس کرتی ہے۔ تب کھلنا شروع ہوتی ہے۔ سورج کی آمد سے بہتر
 وہ بخان ہوتی ہے۔ لیکن شگفتہ نہیں۔

رات پھولوں موتیوں کا ہار پہناتی ہے۔ اور وہ خود بھی ستاروں
 سے جڑی ہوتی ہے۔ اُس وقت پھول نہایت خوبصورت معصوم ہوتے
 ہیں۔ لیکن سورج یہ پسند نہیں کرتا۔ وہ خود حسین نہیں اس لئے
 اُسے پھولوں کا حسن نہیں بھاتا۔ وہ اُسے منادیتا ہے۔

”محبت“

ہاتھ ہاتھوں کو پکڑتے ہیں۔ نگاہیں نگاہوں کے ہمکنار ہوتی ہیں۔
 بس یہی الفت کی ابتدا ہوتی ہے۔
 ماہ مارچ کو خوشگوار چاندنی شب ہے۔ باد صبر خوشبو
 حنا سے معطر ہے۔ میں اپنی رسیلی بانسری فریش خاکی
 پردہ کھڑ کر بھول گیا۔ تمہارا پھولوں کا ہار ابھی
 تک نامکمل ہی ہے۔۔۔۔۔ تمہارے اور میرے درمیان
 یہ اتھا اور پوتر پریم دلکش گیت کی طرح بناوٹ سے
 بالکل مبرا ہے۔

(۲۱)

تمہارا کیسری نقاب میری آنکھوں کو شراب پلا رہا ہے۔
 چینیسی کا ہار جو تم نے میرے واسطے تیار کیا ہے۔ تجھیں کی طرح
 میرے دل میں مدد جند رکھا عالم پیا کر رہا ہے۔ اچھلنے اور
 دبا رکھنے نقاب اٹھانے اور پھر ڈال دینے۔ قدرے مسکراہٹ
 معمولی حیا۔ میٹھی میٹھی ہاتھ پائی یہ تمام کہیں کیسا منو بہر
 ہے۔

تمہارے اور میرے درمیان یہ امتحا اور پوٹو ٹریڈ پریم دلکش
گیت کی طرح بناوٹ سے بالکل متبر ہے۔

(۱۳)

یہ مستقیں کا معجزہ ہیں۔ ناکامی یا ناکامی کیلئے ناکام سچی ہیں۔
چاندنی کے پردہ میں ظلمت ہیں۔ جس کے پردہ میں بد صورتی
ہیں۔ اور نہ ہی بہرے پایاں میں غوطہ زن ہے۔

تمہارے اور میرے درمیان یہ امتحا اور پوٹو ٹریڈ پریم
دلکش گیت کی طرح بناوٹ سے بالکل متبر ہیں۔

(۱۴)

ہم تمام الفاظ چھوڑ کر ابھی خاموشی اختیار نہیں کرتے
ہم ناکام کیلئے ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ جو کچھ ہم دیتے آئے
ہیں۔ وہی کافی ہے۔ ہم نے سرت کو اتنا کھینچا کہ درد کی شراب
برآمد ہو۔

تمہارے اور میرے درمیان یہ امتحا اور پوٹو ٹریڈ پریم دلکش
گیت کی طرح بناوٹ سے بالکل متبر ہے۔

تباک

کافی نیچے جہنا خاموش موجوں میں بہ رہی تھی۔ اُس کا اونچا ساحل جھک گیا تھا۔ پہاڑیاں گھنے درختوں کی وجہ سے خوفناک اندھیری ہو رہی تھی۔ مسلسل ہوسلا دھار بارش نے جاری کر رکھے بنا دیتے تھے۔

شری گوردگو بند سنگھ جی، صبح چٹان پر بیٹھے کتاب خدا کے مطالعہ میں متخرق تھے۔ اُن کا چیلار گھونٹا تھ صاحب ہوا۔ اور قدم چوم کر بولا۔

”حضور کی خدمت میں ایک ناچیز تحفہ لایا ہوں۔ یہ کہنے ہوئے، دو طلائی جوڑیاں نکال کر رکھ دیں۔ جن نادر جواہرات لگے تھے۔ اور ان کی چمک اندھیرے میں اُٹھانے کی لہر پیدا کر رہی تھی۔ ہمارا ایک جوڑی اٹھا کر سدھن کی طرح گھمانے لگے۔ جوہرات کی تیز لہر دشا کی نیش چاروں طرف پھیل گئیں۔ اچانک چوڑی انگلی سے لکل کر کتاب سے نکلرائی اور پانی میں جاگری۔“

”انسوس“

رگھوناتھ چلایا اور دے یا میں کو دپڑا۔ گورو نے اپنی لگاپس
کتاب کی طرف پھیر لیس۔ ندھی نے جو کچھ حاصل کیا تھا۔
مضبوط پکڑ لیا۔ اور اپنی گہری تہ میں پھیا کر مسلسل بہتی رہی۔
سورج دو پہاڑیوں میں غروب ہو رہا تھا۔ جس کی الوداعی سنہری
کرنیں سامنے برف کی پر پڑ کر آنکھوں میں چلکا چوندہ پیدا کر رہی
تھیں۔ جب رگھوناتھ سعی لا حاصل سے تھکا ماندہ واپس لوٹا تو
اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

”ہماراج! اگر یہ معلوم ہو سکے کہ چوڑی کس جگہ گری تھی؟
تو یقیناً میں اُسے اب بھی تلاش کر سکتا ہوں۔“
گورو جی یہ سن کر مسکرائے۔ اور دوسری چوڑی اٹھا کر جنما میں
پھینکتے ہوئے بولے۔

”اس جگہ۔۔۔“

رگھوناتھ گورو جی کے قدموں پر گر پڑا۔ اُس کے آنسوؤں
ہماراج کے پاؤں دھونے لگے۔ کیونکہ اب وطلانی
چوڑیوں سے بیش قیمت روحانی سرور حاصل کر چکا تھا۔ ہماراج نے
ایک نظر اُسے دیکھا پھر اٹھا کر پھانی سے لگا لیا۔

برسات

ساون آیا۔۔۔ دریا کے ساحل پر بنگلوں سا رسوں کے جوڑے
خوشیاں منانے لگے۔

برسات نے دریا کے پانی کو مٹیا لاکر دیا۔ لیکن لہروں
میں نئی روح پھونکی گئی سیاہ اور مست مخمور بادل بدست
ہا بھٹیوں کی طرح جھوا جھوم آئے۔۔۔ آئے اور پلے گئے۔
دریا پار۔۔۔ اس ساحل پر۔۔۔ سکیھوں نے
جامن کے پیڑ میں رنگین جھولے ڈالے۔ اس طرف
سے

آؤ سگھی سی جھولا جھول لیں۔

کی مدھم آواز سنائی دی۔ اور ادھر سے

پیا پلن کی آس

ترنم خیر دھن سنائی دی۔ بگوان پکے کڑھائے چڑھائے گئے
جھل میں منگل ہو گیا۔

آنکھوں میں ساون ختم ہوا۔ مگر پیا سے مدھن موہن
کی منوہر صورت کہیں بھی دیکھائی نہ دی۔۔۔ میں دریا

کے مندر ساحل پر کھڑی یہ تمام دلکش تماشا دیکھ رہی تھی۔
 میرے من مندر کے دیوتا ساکنات نہ آئے۔ ہر دے کی
 پکار بھی نہ سن کوئل کی کوک نے برہ اگن اور بھی پر چند کر دی
 دریا کا پانی آگ کے شعلوں کی طرح بھڑک اٹھا۔
 بڑنم آنکھوں میں ساون کا جل چھلک رہا تھا۔ روکنے پر
 بھی نہ تھم سکا خوب دل کھول کر برسا۔ میں بھیگ گئی۔
 اب مدن موہن ساکنات براجمان تھے۔ دریا کا پانی اتر گیا
 تھا۔ فلک بالکل صاوا تھا۔ تالاب کی سطح ساکن تھی۔ مجھے
 اچھی طرح یاد ہے۔ کہ میں صرف یہی کہہ سکی تھی
 اب کس کارن شیا م ساون بیت گیا

بہندی

دو چیزیں

میں ہمزہ ناز پر ہنسا پہل قدمی کر رہا تھا ۔۔۔ کسی نے پشت سے پکارا۔

”دیکھے پہناتے ہو؟“
میں نے گھوم کر دیکھا۔
نہیں تمہارا نام تو مجھے یاد نہیں“ میں نے تعجب کو چھپاتے ہوئے
جواب دیا۔

میرے اس جواب پر اُس نے خالص قسم کے لہجہ و لہجہ میں کہا۔
”میں وہ مصیبت ہوں۔ جسے تم نے پہلے پہل اپنی زندگی میں چھیدا تھا۔
اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ کیف تھا جو شیخہ کے موتوں سے دھوئے
ہوئے صبح کے رُخ روشن پر ہوتا ہے۔۔۔ چند منٹ چپ رہ
کہ میں نے دریافت کیا۔

”تمہاری آنکھوں کے آنسو کیا خشک ہو چکے ہیں؟“
”وہ دیر لب میں آئی۔ مگر کچھ جواب نہیں دیا۔ میں سب سمجھ گیا
کہ وقت پا کر آنسوؤں نے بھی تعلیم بسم حاصل کر لی ہے۔ اب
اُس نے آہستہ سے کہا۔

”تم تو کہتے تھے میں اس مصیبت کا تازیت فراموش نہ کروں گا۔
 مگر سب برخلاف اس کے آج — ہا“
 ہاں وقت گزرنے کے ساتھ ہی مجھے بھی صبر حاصل ہو گیا۔
 میں نے شرمناکریں نکالیں کرتے ہوئے جواب دیا۔
 پھر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس
 کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے شیریں لہجہ میں کہا۔
 مگر اب تم بھی تو بدل گئی ہونا — !
 وہ پھر سکرانی اور بولی — جس کا نام کل مصیبت تھا۔ اب
 راحت ہے۔“

مائیکور

پُراسرار تصویر !

میں خیالات کے گہرے سمندر میں ڈوبا ہوا اپنے ڈرائیونگ
 روم میں بیٹھا تھا۔ کہ یکایک ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس
 نے بھورے رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ کالر کے
 سوراخ میں ایک سرخ پھول زمینت دے رہا تھا۔ چہرہ تانبا
 کی طرح دھک رہا تھا۔ مونچھوں کے بال سنہری تھے ؟
 ”آپ کا نام مجھے مل گیا تھا۔ اس لیے حاضر خدمت ہوا ہوں ؟“
 اس نے اندر قدم رکھتے ہی کہا :

اگرچہ آرمین لوپن کے آنے کی انتظار نہ ہوتی۔ اور سہلہ ہی
 اس نے مندرجہ بالا الفاظ نہ دہرائے ہوتے۔ تو شاید ہی میں اُسے
 اس لباس میں پہچانتا ۔

”نہیں معاملہ کوئی خاص ضروری تو نہیں۔ ایک معمولی سی بات
 ہے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ آپ کی مدد سے سلجھ جائے گی۔ میں نے
 مسکراتے ہوئے کہا :

”شاید میں پیش از وقت قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا؟ اس

نے جواب دیا۔ ”تو میرے
 ”معلوم ہوتا ہے آپ نے کسی دوسری جگہ بھی جانا ہے؟“
 ”ہاں!۔ مگر آپ میرے اشتیاق کو زیادہ نہ کریں۔ او
 اصل معاملے کی طرف آئیں۔“

”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے اس دست
 تصویر کو دیکھئے۔ جو چند دن ہونے میں نے ایک کوارٹی کی
 دوکان سے خریدی تھی۔ جو دریا کی پرلی طرف واقع ہے۔ فریم
 تو بے شک قیمتی ہے مگر تصویر کو دیکھئے کتنی بھدی۔ کیسی
 اور بالکل بے معنی ہے۔“

لوہن اس تصویر کو نہایت باریک بین نگاہوں سے پانچ
 منٹ تک مسلسل دیکھتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر نہایت
 سنجیدگی سے بولا:

”آپ اس تصویر کو بھدی۔ ضراب اور فضول کہہ سکتے
 ہیں۔ لیکن میں نہیں۔ شاید لاپرواہی سے کام لیا ہو۔ غیر
 نظارہ نہایت دلچسپ ہے۔ دیکھئے یہ رنگ رارستون
 چکر کی شکل میں کیا خوب صورت معلوم ہوتے ہیں یہ دھوپ
 گھڑی اور پھلیوں کا تالاب کتنا دلکش ہے۔“
 ”ہاں۔ کسی اصل نظارے کی تصویر ہے۔ کچھ بھی ہو تو

اچھی ہو یا بُری اس فریم میں سے کبھی نکالی نہیں گئی۔ دیکھئے
 اس کے نیچے تاریخ بھی درج ہے — وہ بائیں طرف —
 کولنے پر — لال حروف — ۱۵-۴-۵۹ یعنی
 ۱۵-اپریل ۱۸۵۹ء

لوپن نے لاپرواہی سے جواب دیا: ”ہوگا — مگر تم کسی
 واقعہ کو بیان کر رہے تھے“

میں نے ٹینل کے دراز سے دور بین نکالی۔ پھر اس کو
 ایک مکان کی طرف پھیرا۔ جو میرے مکان کے بالکل مقابل
 کچھ فاصلے پر واقعہ تھا؛

”اُس دور بین کے اندر دیکھنا“

سورج کی سنہری شعائیں اس وقت سامنے مکان کی
 کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ اس لئے ہر چیز نمایا
 طوع پر نظر آرہی تھی۔ کمرے میں شیشم کی چند کرسیاں۔ ایک
 چھوٹا اور ایک بڑا پلنگ۔ خستہ سامیز۔ یہ مختصر سامان تھا۔
 لوپن دوڑ بین کے اندر دیکھ کر حیرت سے بولا: ”بالکل
 ایسی ہی تصویر سامنے لٹک رہی ہے“

”ہاں! بالکل ایسی ہی۔ یہی تاریخ اُس کے نیچے بھی

لکھی ہے۔“

”ہاں! ہاں! ہاں! تاریخ بھی لکھی ہے۔ مگر یہاں رہتا کون ہے؟“

”ایک عورت — بالکل معمولی حیثیت کی مالک — اور اُس کی لڑکی
عورتِ سلائی کا کام کر کے اپنے عزیت کے دن گزار رہی ہے۔“
”اس کا نام؟“

”لوئی۔ ڈی ارنمانٹ اِعام مشہور ہے کہ یہ ایک بہادر فرانسیسی
جرمنی کی اولاد میں سے ہے۔ جسے انقلابِ فرانس میں قتل کر
دیا گیا تھا۔ اُس کے بارے میں یہ بھی افواہ ہے۔ کہ وہ بہت
مالدار تھا۔“

”بڑی دلچپ کہانی ہے۔ مگر آپ نے تو کبھی اس کا ذکر
نہیں کیا۔“

”آج ہی تو پندرہ اپریل ہے۔“

”پھر؟“

”مجھے کل اس مکان کے ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ ڈی ارنمانٹ
کے خاندان میں پندرہ اپریل کا دن ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔
یعنی؟“

”یہ عورت ہر شام کو اپنا کھانا خود تیار کرتی ہے۔ مگر جب
۱۵ اپریل کا دن آتا ہے تو دونوں ماں بیٹی صبح گھر سے نکلتی ہیں
اور بہت رات گئی واپس آتی ہیں۔ کئی سال سے یہ دونوں اس
طرح کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب یہی تاریخ دونوں

تصاویر پر لکھی ہے۔ تو ضرور لوٹی کا تعلق ان تصاویر سے ہے۔

”مگر لوہن نے میری باتوں کا جواب نہ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ آخر اس نے گردن اٹھائی اور کہا:

”تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ بھی معلوم ہے۔ کہ پندرہ اپریل کو ماں بیٹی کہاں جاتی ہیں؟“
 ”یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ عورت خاموش رہنے والی ہے۔“

”معاہدہ پڑھیں اور دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔
 سامنے دروازے میں ایک چھوٹی سی لڑکی کھڑی تھی۔
 اس کی عمر سات آٹھ سال کے قریب ہوگی۔ مقوڑی دیر بعد
 ایک عورت داخل ہوئی اس کا قد لمبا تھا۔ نقش و نگار خوبصورت
 تھے۔ مگر جہرے پر رنج و غم کے آثار نمایاں تھے۔ دونوں
 کہیں باہر جانے کے لئے تیار معلوم ہوئی تھیں۔ دونوں
 کے کپڑے معمولی مگر سہترے تھے۔ میں نے کہا:

”دونوں جا رہی ہیں۔“

لوٹی بیٹی کا ہاتھ پکڑے باہر نکلی اور بانسار میں اتر گئی۔

لوپن نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور بولا۔

”چلو گے“

چونکہ مجھے خود اس پر اسرار راز کو جاننے میں انس اور دلچسپی سی ہو گئی تھی۔ اس لئے میں نے اس کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ بازار میں ہم نے ان کو ایک مختصر اور معمولی ہوٹل کے اندر جاتے دیکھا۔ عورت کے کچھ کھانا خریدا اور ٹوکری میں جس میں کھانے کی کچھ اور چیزیں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ رکھ لیا۔ پھر دونوں بازار میں سے گذرتی ہوئی ایونیو کلمپس میں پہنچی اور پھر بالسی کی طرف مڑیں۔

لوپن اور میں دبے پاؤں ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ میرا دوست خیالات کے گہرے بانیوں میں غرق معلوم ہوتا تھا۔ آخر دونوں ہاں بیٹی دریا کے سون کے کنارے جا پہنچی۔ اس کے بعد ایک تنگ دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ جس دیواروں پر کا ہی جمی ہوئی تھی۔ اور ان کے کناروں پر حفاظت کے لئے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ دیوار کی بکھیلی طرف ایک مہراب دروازہ تھا اس نے جیب سے ایک بھدی سی رنگ آلود جاپی لگائی۔ اور دروازہ کھول کر دونوں اندر داخل ہوئیں۔ آرمین لوپن میری

طرف دیکھ کر بولا۔

”میں نے خیال میں اس جگہ کوئی بات پوشیدہ رکھنے کے قابل نہیں۔ کیونکہ عورت نے ایک بار بھی پیچھے پھر کر نہیں دیکھا۔“

یونہی اُس کی زبان سے ابھی یہ الفاظ پوری طرح ادا نہ ہوئے تھے کہ پیچھے کی طرف سے ہمیں پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ جب مڑ کر دیکھا تو ایک خستہ حال بوڑھا فقیر تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ دونوں کے کپڑے جگہ جگہ پھٹے ہوئے اور گندے تھے۔ وہ چپ چاپ ہمارے پاس سے گزرے اور اسی دروازہ کے پاس پہنچ کر انہوں نے بھی ایک چابی نکالی۔ اور دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ دروازہ بدستور بند ہو گیا۔

اتنے میں ایک موٹر کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں جھاڑیوں کے پیچھے ہو گئے ہم نے ایک دو شیزہ کو بغل میں ایک کتا اٹھائے موٹر میں سوار آتے دیکھا۔ وہ زیورات سے لدی تھی جسم پر قیمتی کپڑے تھے۔ اس کے بال لمبے اور سنہری مائل تھے۔ یا قوت کو مات کرنے والے ہونٹ اور آہوں کی سی تیز آنکھیں یہ لینڈی بھی اسی دروازہ پر اکر ٹھہری۔ چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ اور

اندر چلی گئی۔ لوہن مسکرا کر کہنے لگا۔ معاملہ بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ خدا جانے ان لوگوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے یا۔ اتنے میں ہمیں دُور سے دو دہلی پتلی عورتیں آتی دکھائی دیں ہم دونوں پھر جھاڑیوں کے پیچھے ہو گئے۔ دونوں کے کپڑے عزیزانہ تھے۔ اور ہم عمر معلوم ہوتی تھیں۔ پیچھے ایک آدمی چپڑاگی و ردی پہنے آ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے پلٹن کا ایک پیادہ سپاہی۔ اس سپاہی کے بعد کچھ مزدور بیٹنہ لوگ تھے۔ ایک آدمی ایک عورت اور چھ بچے سب کے سب بہت غریب اور نانِ شبینہ سے محتاج نظر آتے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹوکری تھی۔ جس میں کھانے کا کچھ سامان موجود تھا۔ یہ سب لوگ اسی دروازہ کی راہ سے اندر چلے گئے۔ میں نے کہا ”کسی خفیہ انجمن کا جلسہ معلوم ہوتا ہے“

عجب تماشا ہے۔ جب تک معلوم نہ کر لوں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ مجھے چین نہ آئے گا۔

دیوار پھاندنا نامکن تھا۔ اور دونوں طرف سے وہ مکان کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی کھڑکی یا دروازہ وغیرہ نہ تھا۔ گھنٹہ بھر تک کوئی آدمی نظر نہ آیا۔

اور ہم دونوں اس مکان میں گھسنے کی تجویز سوچتے رہے۔ آخر تنگ آکر لوہن نے کہا۔ کہیں سے میٹرھی لا کر کوشش کریں۔ میٹر جو اب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ میٹرھی کی تلاش میں جانے ہی والا تھا۔ کہ پھر دروازہ کھلا۔ اور مزدور ہمیشہ آدمی کے بچے باہر نکلے۔ ان میں ایک بھاگ کر بازار کی طرف گیا۔ اور پھر جلد ہی بھاگا ہنوا داپس بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی دو صراحیاں تھیں انہیں دروازہ کے پاس رکھ کر وہ جیب میں چابی تلاش کرنے لگا۔ لوہن کے دیوار کے سائے میں ٹھہل رہا تھا۔ لڑکے نے دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہو کر دوبارہ بند کرنا چاہتا تھا کہ لوہن نے ایک لمحہ میں چاقو چابی کے سوراخ میں ڈال دیا۔ لڑکے نے خیال کیا شاید دروازہ بند ہو گیا ہو۔ مگر دراصل ایسا نہ ہوا۔ اب اندر داخل ہونا کوئی مشکل نہ تھا۔

پہلے تو لوہن نے آہستہ آہستہ دروازے کو دھکیلا پھر بغیر کسی خوف کے اندر داخل ہوا۔ میں نے بھی اس کی تابعداری کی۔ اندر سڑک کے کنارے کنارے دونوں طرف سلسل چھوٹی چھوٹی خوشنما ہری جھاڑیوں کی قطار تھی۔ ہم ان

بھاڑیوں کے سائے میں چھب کر بیٹھ گئے۔ اور ایک جگہ سے
ہنسیاں ہٹا کر دیکھنے لگے۔

نظارہ حیران کن تھا۔ دالان میں بالکل وہی صورت تھی
جو اُس تصویر میں بنائی گئی تھی۔ جو ہماری نظر سے گذر چکی
تھیں۔ اور جن پر ۱۵/۴/۵۲ تاریخ درج تھی۔ وہی یونانی
طرز کے ستون پتھر کے بیچ۔ پھلیوں کا تالاب اور دھوپ
گھڑی۔ ہم دونوں یہ نظارہ دیکھ کر اور پندرہ اپریل کا
خیال کر کے اور زیادہ الجھن میں پڑھ گئے۔ پراسرار
راز تھا۔ حیرت تھی۔ کہ طرح طرح کے پندرہ سو لہ شخص
کیوں اس مکان میں جمع ہیں۔ ان کا آپس میں کیا
تعلق ہے؟ یہ سب آدمی الگ الگ گھاس پر بیٹھے کھانا
کھا رہے تھے۔ ہمارے پاس ہی لوئی ارنمانٹ اپنی لڑکی کے
ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھی۔ اس کی بغل میں مزدور
آدمی اور اس کے خاندانی کھانا کھا رہے تھے۔ سپاہی
چپڑا سی دونوں ہم عمر عورتیں اور وہ موٹا بھدا سا آدمی
وہ بھی ایک طرف بیٹھے تھے۔ وہ یسڈی جو کٹالے کرائی
آئی تھی۔ اکیلی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ مگر لوئی نے اُسے
کچھ کھانے کو دیا۔ اس کے بعد سب نے حقوڑا حقوڑا دیا۔

اور وہ بھی کھانے لگی ۔

اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا ۔ آدمی سگریٹ نکال کر ایک دوسرے کو دے رہے تھے ۔ اور سب عورت مردوں کو اس یونانی ستون والے دالان میں مٹر گشت کر رہے تھے ۔ باہمی الفت ان تمام کی رگ رگ میں معلوم ہوتی تھی ۔ ہم ان کی گفت و شنید نہ سن سکے ۔ کیوں کہ ہم میں اور ان میں چند قدم کا فاصلہ حائل تھا ۔ ان کے چہرے کے اوتار چڑھاؤ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا ۔ کہ گفت و شنید گہری دلچسپ ہو رہی ہے ۔ وہ امیر کبیر لیڈی بہت جوش سے بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ اور اس کا کتا بھی اچھی اچھی کر بھونک رہا تھا ۔ یکا یک ایک طرف سے چلانے کی آواز سنائی دی ۔ اور تمام بھاگ کر کنویں کی طرف چلے گئے ۔ مزدور اور اس کا ایک لڑکا جس کی کمر میں رسی بندھی ہوئی تھی ۔ کنویں میں تھا ۔ اور اس کے دوسرے بھائی اسے باہر کھینچ رہے تھے ۔ اتنے میں سپاہی اور چہڑا سی دونوں آگے بڑھے اور بچوں کے ہاتھ سے رسی لے کر اوپر کھینچنے لگے ۔ کچھ فاصلہ پر چند آدمی آپس میں لڑنے بھگڑنے لگے پڑے ۔ اور ہاتھ بائی تک کی نوبت پہنچ گئی ۔ بچوں کے میلے اور

برانے کپڑوں کے پیمٹس اڑ گئے۔ کئی لوگ ان ٹکڑوں کو
 لے کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اور بچے زور
 زور سے چلانے لگے۔ گویا باگلوں کی سی حرکات کر رہے تھے۔
 میں نے لوہن سے کہا: "یہ لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے؟"
 "نہیں تم چپ رہو اور دیکھتے جاؤ۔"

"تمہارے خیال میں کوئی رسم ادا کی جا رہی ہے۔"
 مگر لوہن نے کچھ جواب نہ دیا۔ جیسے اس نے سنا ہی نہیں
 اس وقت ایک عورت کتے کو بغل میں دبائے ایک بچے
 کے پیچھے جس کے سر پر ایک بھٹی ہوئی قمیض تھی۔ بھاگ
 رہی تھی۔ اور بچہ کسے بچہ بیچ بیچ کر اور گلا بھاڑ
 بھاڑ کر چلا رہا تھا۔"

یہ دونوں بھاگتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے بچہ
 بھاگ کر اپنی ماں سے بنا پڑا۔ آخر کار لڑی ڈی ارمانٹ
 جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اٹھی اور سب کو کچھ کہہ کر
 اپنی اپنی جگہ بٹھا دیا۔ اب یہ لوگ بالکل خاموش تھے
 کچھ دیر بعد جب ہمیں بھوک نے ستایا تو میں اس روڈ
 سے باہر نکلا اور بازار سے کچھ کھانے کا سامان لے کر واپس
 لوٹا۔ ہم دونوں نے جھانڈیوں کی ادٹ میں کھانا کھایا۔

یہ لوگ ابھی تک سر جھکائے کسی گہری سوچ میں خاموش بیٹھے تھے۔ سب رنجیدہ معلوم ہوئے تھے۔ چہرے سے نا اُمیدی اور تکلیف کی جھلک نمایاں تھی۔ دوپہر کا وقت اسی حالت میں غروب ہونے لگے تھے۔ کہ میں نے اگتا کر لوہن سے کہا:

کہ کیا یہ لوگ رات بھی یہیں گزاریں گے یا مگر اس نے سنا ان سنا کر دیا۔ شاید وہ اپنے کانوں میں گھملا ہوا شیشہ ڈال کر ہمیشہ کے لئے سننے والی قوت کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ آخر شام کے پانچ بجے اس موٹے بھدے آدمی نے بیب سے گھڑی نکالی اور وقت دیکھنے لگا۔ سب عورت مرد خوش ہو کر اپنی اپنی گھڑیاں نکال کر دیکھنے لگے۔ اور کسی واقع کی بڑے شوق سے انتظار کرنے لگے۔ آخر پندرہ منٹ بعد اس موٹے آدمی نے نا اُمیدی کی حالت میں ہاتھ سر پر دے مارا اور گھڑی جیب میں ڈال لی۔ کیوں کہ جس چیز کی انتظار میں مضطرب معلوم ہوتے تھے وہ نظر نہ آئی۔ سب نے گھڑیاں بند کر لیں۔ اور ہر طرف رونے اور آہیں بھرنے کی آواز آنے لگی۔ مزدور کے

خاندان کے لوگ اور دونوں ہم عمر عورتیں گھنٹوں کے
کے بل دھا کرنے لگیں۔ اور ہوا میں ”در کراس“
بنانے لگیں۔

زیورات والی لیڈی نے بھکاری کی بیوی کے
ماحقے کو بوسہ دیا اور دونوں نے مل کر آنسو بہائے
لوٹی ڈی ارمانٹ نے محبت سے اپنی بیٹی کو گلے لگا کر
یہ دیکھ کر لوپن بولا۔ ”پلو اب چلیں“
”کیوں؟“

”اب ہمیں باہر جانا چاہیے“
ہم دونوں تمام کی نظروں سے پکتے ہوئے وہاں سے
نکلے۔ کسی کو ہمارے آنے کا حال معلوم نہ ہوا۔ بازار
کے ایک کونے پر پہنچ کر لوپن نے مجھے وہاں کھڑا کیا۔
اور خود ایک طرف چلا گیا۔ اور ایک مکان کے چوکیدار
سے چند باتیں کروا پس آ گیا۔ یہ مکان اس طلسمی مکان کے
پاس ہی تھا۔ جہاں ہم نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا
تھا۔ ہمیں راستے میں کرائے کی گاڑی مل گئی اور ہم
دونوں اس پیس سوار ہو گئے۔ لوپن نے کوچوان سے کہا۔
ہمیں بازار نیورپن کے مکان نمبر ۳۲ پر پہنچا دو۔

مکان نمبر ۳ کی پچھلی منزل پر وکیل و ولیم ڈائر کا دفتر تھا وہ خوش طبع انسان تھا۔ گارڈ بھیننے پر اس نے جھٹ اندر بلا لیا۔ اس جگہ لوہین کا نام کپتان جینٹ تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک پینٹرز فوجی افسر ظاہر کیا۔ لوہین نے نہایت شیریں زبان سے وکیل کو مخاطب کیا۔

میں بازار رین یارڈ میں مکان بنانے کے لئے ایک ٹکڑہ خریدنا چاہتا ہوں۔ وہ جگہ بہت مدت سے غیر آباد ہے۔ وہاں ایک شکستہ عمارت مافسی کی یادگار بھی موجود ہے۔ جناب وہ عمارت بیچنے کیلئے نہیں۔ وکیل نے نرم لہجہ میں جواب دیا۔

لیکن مجھے تو یہی معلوم ہوتا تھا۔
مجھے نوڈانسوس ہے کہ آپ کو کسی نے بالکل غلط اطلاع دی ہے!

یہ کہہ کر وکیل صاحب اٹھے اور ایک تصویر ہمیں دکھلانے کیلئے اٹھا لائے۔۔۔۔۔

جوں ہی میری نظر اس پر پڑی میں حیران ہو گیا۔ بالکل وہی جیسی کہ ایک میرے پاس اور ایک لونی ڈی آرمانٹ کے کمرے میں لٹک رہی تھی۔ وکیل نے کہا۔ دیکھئے

یہ اسی جگہ کی تصویر ہے جو آپ خریدنا چاہتے ہیں۔

”ہاں! بلاشبہ“

یہ ٹکڑہ زمین اس جرمنیل کی جائیداد کا ایک حصہ ہے جسے انقلاب فرانس میں قتل کیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ تمام جائیداد اس کے خاندان کے لوگوں نے بیچ ڈالی۔ مگر یہ ٹکڑا ان لوگوں نے روک رکھا ہے... جب تک... دیکھیں کہ کھلا کر سنس پڑا۔
”جب تک کیا؟“

یہ نہایت دلچسپ افسانہ ہے۔ اور وقت گزارنے کے لئے اس کی مشیل دیکھا کرتا ہوں۔
”مگر کیا میں سن سکتا ہوں؟“

”ہاں! کیوں نہیں؟“

انقلاب فرانس کے کچھ دن پہلے ایک شخص لوٹس آگری یا ڈمی ارمانٹ نے یہ بہانہ کر کے کہ میں اپنی بیوی سے جو جینوا میں ہے، ملنے جاتا ہوں۔ اپنا لینٹ جرمن وال مکان بند کر دیا۔ تمام نوکر کال دیئے گئے۔ وہ اپنے لڑکے اچا رلس کو ساتھ لیکر اس مکان میں جو جگہ پالیسی میں ہے، چھپ رہا۔ اب اس کے پاس صرف ایک بوڑھی غلام بھی جو کھانا تیار کرتی تھی۔ جرمنوں کو اس پر کامل الفت تھی۔

کیونکہ وہ اُس کی مدت سے غیر خواہ مخفی ۔ اس کو پورا یقین تھا۔ کہ میں یہاں بے خوف زندگی کے دن گزار سکتا ہوں۔ ایک دن کھانا کھانے کے بعد پائپ سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ کہ بوڑھی خادمہ ہانپتی کانپتی کرے میں داخل ہوئی۔ اور لرزتی ہوئی زبان سے اپنے مالک سے کہا کہ مسلح سپاہی ادھر آ رہے ہیں۔ لونی ڈی رنمانٹ ہوشیار ہو گیا۔ اور جب سپاہی دعوٰی کھٹکھٹا رہے تھے تو وہ بلع کی طرف بھاگا۔ اور اپنے لڑکے کو آواز دی کہ صرف پانچ منٹ تک انہیں روکے۔ مگر اس کی قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ باغ کی چار دیواری کے باہر سپاہی کھڑے تھے۔ اس لئے وہ بھاگ نہ سکا۔ اور واپس آکر سپاہیوں کے سوالوں کا جواب نہایت دلیری سے دیتا رہا۔ اور آخر ان کے دھمکانے پر ان کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ اس کے لڑکے چارلس کو بھی قید کر لیا گیا۔ جس کی عمر ابھی صرف اٹھارہ سال کی تھی۔

”یہ کب کا واقعہ ہے؟“

”پندرہ اپریل ۱۸۵۲ء کا“

یعنی آج کا دن جرمنی کی گرفتاری کی یادگار ہے!

مسٹر ویلم ڈائر نے کیلنڈر اٹھا کر دیکھا اور کچھ حیرت سے بولا۔

ہاں اسی دن جرینیل گرفتار ہوا تھا،
 ہجرت انگیز واقع ہے۔ میرے خیال میں تو اس کا انجام بُرا
 ہوا ہوگا۔

ہاں نہایت خوفناک۔ بہت بُرا۔ کچھ دیر بعد عزیز جرینیل
 قتل کر دیا گیا۔ چارلس جیل میں ہی رہا۔ اور اس کی تمام جائداد
 ضبط کر لی گئی۔

جائداد بھی تو کافی سے زیادہ ہوگی،
 یہ راز کج تک پوشیدہ ہے۔ اس کی اتنی بڑی جائداد کا کسی
 کو آج بھی پتہ نہ لگا۔ چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ جرینیل کالینٹ
 جرمن والا مکان۔ باغ۔ باغیچے اور جواہرات ایک انگریز نے
 خرید لئے ہیں۔ کافی سے زیادہ کوشش کی گئی۔ مگر اس دولت کا
 کچھ پتہ نہ چلا۔

ملحقہ باغ اور مکان؟

جس نے جرینیل کو گرفتار کیا تھا یہ مکان اسی شخص نے بہت سزا
 خرید لیا۔ اور اسی مکان میں اپنی رہائش کی۔ آخر جب چارلس کی سزا کو نجات
 ملی تو وہ اپنے قدیمی مکان کی طرف آیا تو براکیٹ نے اس پر فار کیا۔ مگر نشانہ
 خطا ہوا اور وہ بچ گیا۔ اس کے بعد چارلس نے براکیٹ پر
 دعوے کر دیا۔ مگر اب بھی قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

اور عدالت نے خلاف فیصلہ کر دیا۔ آخر چارلس نے آخری کوشش کی۔ اور کچھ رقم دے کر وہ مکان خریدنا چاہتا تھا۔ مگر براکیٹ نہ مانا۔ اور شاید براکیٹ عمر بھر اس مکان کا مالک رہتا۔ مگر چارلس نے نیپولین پونا پارٹ سے دوزانو ہو کر عرض کی کہ حضور انصاف کریں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نیپولین کے دل میں رحم کا طوفان اُٹھ آیا۔ اور دوسرے ہی دن سرکاری حکم سے براکیٹ نے 2 فروری 1803 کو مکان خالی کر دیا۔ چارلس کو اتنی مسرت ہوئی کہ مکان تک پہنچنے سے پیشتر ہی آہٹائی خوشی کی وجہ سے پاگل ہو گیا۔

اف! — پھر اس کا کیا انجام ہوا؟

اس دوران میں اس کی ماں اور بہن دونوں راہی ملک عدم ہو چکی تھیں۔ اس نے بوڑھی خادمہ نے چارلس کی تمام ذمہ داری اپنے اوپر اٹھائی۔ اور اس مکان میں رہنے لگی۔ 1912 میں نزع کی حالت میں ملازمہ نے اپنے دو بیٹوں کو بلایا۔ اور لڑتی ہوئی آواز میں کہا۔ کہ جرنیل گرفتاری سے کچھ دیر پہلے اس مکان میں لا انتہا دولت لایا تھا۔ مگر اس کی گرفتاری کے بعد اس تمام کا کچھ بچہ نہ چلا۔ چارلس سے صرف یہ معلوم ہوا۔ کہ مرحوم جنرل نے تمام جائیداد کہیں زمین

میں دفن کر دی تھی۔ اپنے بیان کے ثبوت کے لئے ملازمہ نے تین تصویریں دکھائیں۔ یہ تینوں تصویریں جنرل کی قید کے دنوں میں جیل میں بنائی گئی تھیں۔ اور کسی طرح اُن کو خادمہ کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک خط تھا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ یہ تینوں تصاویر میری عورت لڑکی اور لڑکے میں تقسیم کر دی جائیں۔ مگر روپے کے لالچ میں بوڑھی خادمہ اور چارلس نے یہ راز کسی کو نہ بتایا۔ اور یہ تینوں تصاویر اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد چارلس نے مکان کے لئے مقدمہ کیا اور پھر مکان پر قبضہ جمایا۔ اس کے بعد وہ پاگل ہو گیا۔ ملازمہ اُس خزانے کو تلاش کرنے کی بہت ساری کوشش کرتی رہی مگر کامیاب نہ ہوئی؛

تو کیا وہ خزانہ ابھی تک کسی کو نہیں ملا؟

نہیں! ابھی تک وہیں موجود ہے۔ اگر بروکیٹ نے جو اُس کی تلاش میں تھا نہ نکال لیا ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ بروکیٹ عزت کی حالت میں فوت ہوا!

پھر؟

پھر تمام خاندان ہی خزانہ کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔

مگر چارلس کا کیا ہوا؟

وہ ہر وقت کمرے میں ہی رہتا۔ اُس کی زندگی خاموش زندگی

تھی ؟

یعنی ؟

چارلس سال میں صرف ایک بار شائد کسی خیال کے زیر اثر باہر نکلتا تھا۔ اور باغ کی اس سڑک پر جلتا۔ جہاں اس کا باپ گرفتاری سے پہلے گیا تھا۔ پھر یا تو اس یونانی ستون کے پاس جا کر بیٹھ جاتا یا کوئٹہ کے پاس۔ اور پھر بالآخر کج کر تائیس منٹ پر وہاں سے اٹھتا۔ اور کمرے میں واپس چلا جاتا۔ ہر سال ۱۵ اپریل کو وہ باہر نکلتا اور جب دستو در چکر لگا کر واپس کمرے میں چلا جاتا۔ ۱۸۲۵ میں راہی ملک عدم ہوا کچھ دیر چٹ رہنے کے بعد سوال کیا ” اچھا چارلس کی موت کے بعد“۔۔۔“

اُس کی موت کے بعد اُس کے رشتہ دار اور اُس کی بھین کے رشتہ دار ہر سال پندرہ اپریل کو وہاں اکٹھے ہوتے ہیں پہلے کچھ سال تو انہوں نے زمین کا کون کونہ کھود ڈالا مگر اب یہ کام بند ہے۔ اور اب وہ شان زونادر کوئی جگہ کھودتے ہیں زیادہ تر یہ لوگ اس ستون کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور چاہیں کس طرح کسی آسمانی آواز کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ کام مدت سے جاری ہے۔ میں نے اس مکان کی مرمت بھی کرائی ہے۔ مگر یہ لوگ اس کو اسی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں۔

’آپ کی کیا رائے ہے؟‘

’میری اپنی رائے تو یہ ہے۔ کہ اس جگہ پر کوئی خزانہ وغیرہ نہیں۔ اور ہمارے پاس اس بات کا ثبوت بھی ہے۔ کہ اس بوڑھی نوکرانی نے اپنے بستر مرگ پر جو کچھ کہا وہ کھٹک ہے اور ایک باگل جو ہر سال ایک ہی تاریخ کو ایک خاص جگہ پر آکر گھنٹو بٹھکا رہے۔ اس میں کیا راز ہو سکتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ جنرل نے اپنا خزانہ اکٹھا کیا تھا۔ پھر اس طرح دھونڈنے سے ضرور مل جانا چاہیے تھا۔ کاغذ یا اور ایسی ہی چیز تو آدمی چھبا کر رکھ سکتا ہے۔‘

’یعنی کہ یہ تصویر فضول ہے؟‘

’جے شک بے معنی ہیں۔ ان میں سے کیا خاک پتہ ملتا ہے لوہن جھک کر وہ تصویر جو وکیل نے نکالا تھا۔ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا آپ نے تین تصویروں کا ذکر کیا تھا؟‘

’ہاں ایک یہ موجود ہے جو چارلس کے رشتہ داروں نے ہمیں دیا ہے۔ دوسری لوئی ڈی ارمانٹ کے پاس ہے۔ اور تیسری کا کچھ پتہ نہیں کیا ہوا۔‘

’لوہن میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ اور کیا ان سب پر ایک ہی تاریخ لکھی ہے؟‘

ہاں سب پر ایک ہی تاریخ ہے۔
 کبھی کسی اور شخص نے بھی اس راز کا پتہ لگانے کی کوشش

کی؟
 مسٹر ویم ڈائر بولا۔ ایسور! لوگوں نے تو ہمیں تنگ کر رکھا
 تھا۔ ہزاروں نے قسمت آزمائی۔ آخر ہم نے تنگ آ کر یہ فیصلہ
 کیا کہ رشتہ داروں کے سوا جو آدمی گڑھے ہوئے خزانہ
 کی تلاش کرنا چاہیے۔ وہ فیس دے۔
 کتنی فیس؟

ایک ہزار فرانک۔

کیا لوگ اس شرط کے لگنے سے ڈر گئے؟
 نہیں ابھی تو پچھلے سال ہنگری کا ہینا ٹسٹ میریج میں
 آیا تھا۔ جس نے میرا سال بھر فضولی گنوا دیا۔ آخر ہم نے
 یہ فیس بڑھا کر پانچ ہزار فرانک کر دی۔ اور یہ شرط لگا
 دی۔ کہ اگر کوئی شخص یہ گڑھا ہٹوا خزانہ معلوم کرے تو اس
 تیسرا حصہ دیا جائے گا۔ اور اگر وہ کامیاب نہ ہو تو فیس
 کاروبار اس مکان کے وارثوں میں بانٹ دیا جائیگا۔ تب
 کہیں یہ بلا ٹلی ہے۔

لوپن کہنے لگا لیجئے یہ پانچ ہزار فرانک موجود ہیں۔

دیکھیں چونک کر کہنے لگا یہ کیا؟
 لوہین نے جیب سے ایک ایک ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر رکھ
 دیئے۔ اور بولا کہ یہ پانچ ہزار فرانک بچھے۔ ایک رسید لکھ دیجئے
 اور جنرل کے سارے وار توں کو اطلاع دے دیں کہ اگلے
 سال پندرہ اپریل کو مجھے اس جگہ پر ملیں۔
 دیکھیں اور۔ میں خود بھی حیرت سے لوہین کی طرف دیکھنے
 لگے۔ آخر مسٹر ویم ڈارٹ نے کہا۔

”سچ منج؟“

”ضرور۔“

مگر یاد رہے کہ اس خزانے کا کوئی صاف ثبوت نہیں ہے
 میں آپ سے اختلاف رائے ظاہر کرتا ہوں۔
 وکیل نے بڑے غور سے لوہین کی طرف دیکھا۔ شاید وہ
 اسے پاگل سمجھنے لگا تھا۔ پھر کاغذ نکال کر رسید لکھ دی۔
 کہ اگر کامیاب ہو گیا تو تیسرہ حصہ اسے دیا جائے گا۔ زبانی
 اس نے کہا اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو مجھے کم از کم ایک ہفتہ
 پہلے اطلاع دے دیں۔ جس سے میں ان لوگوں کو خواہ
 مخواہ تکلیف نہ دوں۔ مگر لوہین نے لاپرواہی سے کہا۔
 مسٹر ویم ڈارٹ آپ ان لوگوں کو آج ہی اطلاع دے دیں۔

جس سے وہ سارا سال خوشی سے گزار سکیں۔
 ہم نے وکیل سے ہاتھ ملایا۔ اور باہر بازار میں آئے۔
 میں نے پوچھا لوہن کچھ پتہ مل گیا ہے یا
 دیکھئے لگا نہیں۔ ابھی تک تو خاک پتہ نہیں چلا۔
 اور تم یہ بھی سن چکے ہو کہ لوگ ہزاروں بار ڈھونڈ
 چکے ہیں۔

ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت تو صرف عورت سے
 سوچنے کی ہے اب مجھے غور کرنے کے لئے سال بھر 365 دن
 مل گئے ہیں۔ جو ضرورت سے بہت زیادہ ہیں۔ ڈر ہے کہ
 میں اس معاملہ کو بھول ہی نہ جاؤں۔ اس لئے تم مجھے کبھی کبھی
 یاد دلاتے رہا کرنا۔

وقت گذرتا گیا۔ اس کے دو دن میں میں نے لوہن کو کئی بار
 یاد دلایا کہ پندرہ اپریل کا دن نزدیک آ رہا ہے۔ مگر اس
 نے کبھی اس پر بہت غور نہ کیا۔ اس کے بعد وہ کئی ہفتے تک
 کہیں غائب رہا۔ اور اس سے میرا ملاپ نہ ہو سکا۔ بعد میں
 مجھے معلوم ہوا کہ وہ ارمانیا گیا ہوا تھا۔ اور اس کے ہی خطوط
 سے سلطان ابدل ہمید کو شہنزل ہوا۔
 میں کبھی کبھی اس کو خط لکھا کرتا اور یاد دلاتا رہتا تھا۔

میں نے اسے لوئی ڈی ارنانٹ کی ایک شخص سے محبت کا واقعہ لکھا
مجھے معلوم ہوا کہ لوئی جو ایک بیوہ تھی ایک دولت مند لڑکھن
پر عاشق ہو گئی۔ اور وہ بھی اس سے شادی کرنے کو تیار تھا۔
مگر اس کے خاندان کے لوگ اس کے خلاف تھے۔ آخر اس
نے لوئی کو جواب دے دیا۔ بیچاری لوئی کی حالت اس وقت
قابل رحم تھی۔

مگر لوپن نے میرے کسی بھی خط کا جواب نہ دیا۔ مجھے شک
ہوا کہ میرے خطوط اسے ملتے بھی ہیں کہ نہیں۔ ادھر پندرہ
اپریل کا دن آ رہا تھا۔ اور میں حیران تھا۔ کہ دیکھوں لوپن
وقت پر پہنچ سکتا ہے کہ نہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ پندرہ اپریل کا
دن آ گیا۔ اور میرے ناشتہ کے وقت تک لوپن کا پتہ نہ تھا۔
تنگ آ کر میں خود ایک گاڑی میں سوار ہوا۔ اور پاس والے
مکان کی طرف چلا۔ مکان کے باہر مزدور آدمی کے چاروں بچے
کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے آنے کی خبر مسٹر ولیم ڈائٹر کو
دسی۔ وکیل مجھ سے بڑی اچھی طرح ملا۔ اور کہا کہ پتہ
جینٹ کہاں ہے۔

میں نے حیران ہو کر کہا۔ کیا ابھی تک نہیں آئے؟
وہ بولا نہیں۔ اور یہاں تو ہر ایک شخص گھبرا رہا ہے۔

یہ سب لوگ وکیل کے گر کھڑے ہو گئے تھے۔ آج ان کے چہروں پر وہ اوداسی نہ تھی۔ جو ہم نے اسی دن بچھلے سال دیکھی تھی۔ اتنے میں مسٹر ویم ڈائری بولا۔ ان لوگوں کو اس وقت پوری امید ہے کہ ان کو خزانہ مل جائے گا۔ مگر میرا اس میں کیا قصور ہے۔ آپ کے دوست نے مجھے یقین دلایا تھا۔ کہ میں ضرور اس خزانے کو نکالوں گا۔

وکیل نے کپتان جینٹ کے متعلق جو لوپن کا فرضی نام تھا۔ مجھ سے کئی باتیں پوچھیں۔ اور میں اس کا ایسا دلچسپ جواب دیتا تھا کہ جنرل کے وارث بڑے شوق سے سنتے تھے۔ آخر وہ بھٹا موٹا سا آدمی بولا۔ اس کا تو ہمیں یقین تھا کہ یہ خزانہ آج مل جائیگا۔ سب لوگ اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ لوئی ڈی ارمانٹ بولی۔ اور اگر یہ کپتان صاحب آئے ہی نہ تو ایک شخص کہنے لگا۔ کوئی ڈر نہیں۔ پانچ ہزار فرانک تو ہمارے ہیں۔

مگر سب لوئی ڈی ارمانٹ کے یہ الفاظ سن کر کچھ غمگین سے ہو گئے۔ ڈیڑھ بج گیا۔ سب لوگ کپتان جینٹ کی انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ اور ایک کے بعد دوسرا زمین پر بیٹھنے لگے۔ موٹا بھٹا آدمی غصے سے بولا۔ سارا قصور مسٹر ویم ڈائری کا

ہے۔ ان کا فرض تھا کہ اس بھلے مانس کو ساتھ لائے۔ سب میری طرف گھور کر دیکھنے لگے۔ میں دل میں لوہین کو نہ آنے پر کوس رہا تھا۔ آخر میں نے وکیل کو دبی آواز میں کہا۔ میرے خیال میں وہ نہ آئیں گے۔

میں واپس جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سب سے بڑا لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ کوئی آدمی موٹر سائیکل پر آ رہا ہے۔ بے شک دیوار کی دوسری طرف کوئی بڑی تیزی سے موٹر پر آ رہا تھا۔ اس نے پاس آ کر سائیکل کو روکا۔ اور ہلدری سے اُترا۔ کپڑے ایسے تھے۔ جیسے پہن کر کوئی آدمی موٹر سائیکل کی سواری نہیں کرتا۔ وکیل نے اجنبی کو دیکھ کر کہا۔ یہ تو کپتان جینٹ نہیں ہیں۔

لوہین نے ہم سے ہاتھ ملایا۔ اور کہنے لگا۔ کیوں نہیں میں ہی تو کپتان جینٹ ہوں۔ اس میں نے اپنی مونچھیں مونڈ ڈالی ہیں۔ مسٹر ویم ڈاؤر دیکھے دیا آپ کی رسید موجود ہے۔ پھر ایک نیچے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کہنے لگا۔ بازار سے ایک کرائے کی موٹر جلد لاؤ۔ میں نے دو بجے یا زیادہ سے زیادہ سوا دو بجے یہاں سے چلے جانا ہے۔ یہ سُن کر سب لوگ شور مچانے لگے مگر کپتان جینٹ نے

گھڑی نکال کر کہا۔ ابھی دو بجنے میں بارہ منٹ ہیں۔ ابھی کافی وقت سے مگر خدا جانتا ہے کہ میں بہت بھوکا اور مٹکا ہوا ہوں۔

سپاہی نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا اُسے دیا۔ جسے وہ ایک طرف بیٹھ کر کھانے لگا۔ اور بولا امید ہے آپ لوگ مجھے معاف کریں گے۔ مار سیبلز سے جو ڈاک گاڑی آتی ہے۔ میں اس میں سوار تھا۔ راستے میں گاڑی پٹری سے اتر گئی۔ واقعہ سے دس بارہ آدمی مر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ میں ان لوگوں کی مرہم پٹی میں لگا رہا۔ یہ موٹر سائیکل مجھے وہیں مل گیا۔ مسٹر ویم ڈائر ہر بانی کر کے اس کے مالک کے پاس پہنچا دیں۔ اس کے نام کا لیس اس پر لگا ہوا ہے۔ واہ! تم آگئے۔ گاڑی نے آئے۔

لڑکے نے کہا جی ہاں بازار کے کونے پر گھڑی ہے۔ لوہن اٹھا۔ اور گھڑی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا اب ہمیں وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔

سب لوگ بڑے شوق سے کپتان صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں خود حیران تھا۔ مگر مجھے چونکہ لوہن کے کمال کا علم تھا۔ اس لئے میں چپ رہا۔ وہ اپنی جگہ سے

اٹھا اور دھوپ گھڑی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔
یہ گھڑی ایک آدمی کی شکل کے ستون پر کھڑی تھی۔ ستون کے
ساتھ ایک سنگ مرمر کا تختہ لگا ہوا تھا۔ اور اس پر کچھ لفظوں
کی نقش و نگاری کی گئی تھی۔ مگر الفاظ اس قدر دھندلے
تھے کہ بہتہ نہ لگتا تھا۔ کہ اس پر کیا لکھا تھا۔ اس پتھر
کی تختی پر محبت کے دیوتا کی تصویر تھی۔ اور اس کے ہاتھ
میں ایک تیر تھا۔ کپتان بڑے غور سے جھک کر گھڑی کو
دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ کوئی شخص چا تو دینے کی ہر بانی کرے،
پاس ہی کسی جگہ کے گھڑیال نے دو بجائے اور ٹھیک
اسی وقت دیوتا کے تیر کا سایہ گھڑی کے ڈائیس پر ایسی
جگہ آیا جہاں سے وہ سنگ مرمر کی تختی ٹھیک دو حصوں
میں کھل جایا کرتی تھی۔ کپتان نے چاقو لے کر بڑی بھرتی
سے اس پتھر کی تختی پر سے جہاں تیر کا سایہ پڑ رہا
تھا۔ مٹی کھودنی شروع کی۔ چار پانچ انچ کھودنے
پر چاقو کسی چیز پر رکا۔ کپتان نے انگوٹھ اور ایک
انگلی اس جگہ میں داخل کی اور مٹی میں ڈھکی ہوئی
ایک چیز نکال لی اور وکیل کو دے دی۔ اور کہنے لگا۔ لیجئے
یہ ابھی آغاز ہی ہوا ہے۔

یہ ایک بہت بڑا چمکدار ہیرا تھا۔
 پھر بڑے غور سے چاقو سے مٹی کھودنے لگا۔ پھر اس کا
 چاقو کسی چیز سے رکا۔ اور پھر اس نے انگلی ڈال کر ایک
 بڑا ہیرا نکالا۔ اسی طرح تیسرا اور پھر چوتھا یہاں
 تک کہ اس نے ایک کے بعد ایک اٹھارہ بیس قیمت ہیرے
 نکال دیئے۔

سب لوگ سو رہی کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔
 اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کی طرف دیکھ رہے تھے۔
 آخر موٹا شخص بولا واہ ای قیمت!۔
 وکیل کہنے لگا۔ شاہباش کپتان صاحب شاہباش۔
 سب لوگ مارے خوشی کے پاگل ہو گئے تھے۔ آخر وہ کچھ
 ٹھنڈے ہوئے۔ تو کپتان جینٹ کا شکریہ ادا کیا۔ مگر یہ
 دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے کہ وہ وہاں موجود
 نہ تھا۔ ان کے بغیر دیکھے ہی نہ جانے کہاں چلا گیا
 تھا!

(۳۳)

اس کے کئی سال بعد مجھے لوہن سے ملنے کا موقعہ
 ملا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ تم نے وہ سارا کیسے حل کیا؟

وہ بڑی لا پرواہی سے کہنے لگا۔ ان اخطارہ ہیسروں کے
 معائنے کا ذکر کرتے ہو۔۔۔۔۔ مجھے حیرانگی ہے
 کہ اس دبے ہوئے خزانے کو بہت باریسنگٹروں نے
 ڈھونڈا مگر کامیاب نہ ہوئے۔ چاہے وہ اخطارہ بیش
 قیمت ہیرے ذرہ سی مٹی میں دبے تھے۔

میں نے کہا مگر تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ اس سنگ
 مرمر کی تختی میں ہی یہ ہیرے رکھے ہوئے ہیں؟
 اندازہ کیا! میں اس پر بہت دیر سوچتا رہا۔ مجھے
 پہلے ہی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ اس راز کو فاش
 کرنے کا بھید اس سنگ کے تیر میں چھپا ہے!

چارلس نے پاگل ہونے سے پہلے ان تصویروں پر جو
 ایک ہی تاریخ لکھ دی تھی۔ وہی اس راز کو فاش
 کرنے والی تھی۔ مگر بعد میں جب وہ پاگل ہو گیا۔ تو صرف
 ایک عادت سے وہ ہر سال پندرہ ابریل کو باغ میں آ
 جاتا تھا۔ اور دھوپ گھڑی یا کنوئیں کے پاس بیٹھتا
 تھا۔ اور پھر ہمیشہ ٹھیک اسی وقت یعنی پانچ بج کر پانس
 منٹ پر واپس چلا جاتا تھا۔ لیکن ہے۔ کہ اس کے
 دلخ میں یہ بات کسی طرح آئی ہو۔ مگر وہ عقل

ٹھکانے نہ ہونے کی وجہ سے اس راز کے کھونے
 میں ناکامیاب رہا ہو۔ مگر ہر حالت میں اس کا
 ایسا کرنے کی وجہ مرے ہوئے جنرل کی یقین تصویریں
 اور دھوپ گھڑی ہی تھی۔ زمین کا سورج کے
 گرد چکر لگانا ہی چارلس کو گھڑی کے پاس آنے
 کو اکساتا تھا۔ اور کیوں کہ یہ سال بھر میں صرف
 ایک بار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ پانچ سال میں ایک ہی
 بار ایک ہی وقت ایک ہی تاریخ پر اس کو ڈھونڈھنے
 نکلتا تھا۔ اور پانچ بجے کیوں کہ اس باغ میں چھا یہ پڑنی
 شروع ہو جاتی تھی۔ اور دھوپ گھڑی سے
 سورج گذر چلتا تھا۔ اس لئے وہ اس وقت کمرے
 میں واپس جاتا تھا۔ ان سب باتوں سے میں اس فیصلہ
 پر پہنچا کہ دھوپ گھڑی میں ہی معاملے کا راز چھپا ہے۔
 مگر تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ٹھیک دو بجے دھوپ
 گھڑی کے اوپر مدن کے تیر کا سایہ جس جگہ ہو گا۔
 وہیں اس کا بھید کھل جائے گا؟

وہ کہنے لگا یہ بڑی آسان بات تھی۔ تصویروں
 سے یہ پتہ چلتا تھا۔ تصویروں پر تاریخ کے طور پر

جو دو کا ہندسہ لکھا تھا۔ اس سے میں اس فیصلہ پر پہنچا کہ اس ہندسے کا اس سائز کو فاش کرنے میں ضرور حصہ ہے !

یعنی تمہارے خیال میں یہ دو کا ہندسہ دھوپ گھڑی کے چھ بجے کا اشارہ تھا۔

بے شک جنرل نے اپنی ساری جائیداد جمع کر کے اس سے یہ اٹھارہ ہیرے مول لئے۔ جب سپاہی اس کو پکڑنے آئے تو وہ باغ کی طرف بھاگا۔ خوش قسمتی سے اس کی نظر دھوپ گھڑی پر پڑی اس وقت دو بجے تھے۔ اور سنگ مرمر کی تختی میں جو برابر ٹوٹا ہوا تھا۔ اس وقت سوئی کا سایہ اس پر پڑ رہا تھا۔ اس لئے جنرل نے یہ ہیرے مٹی میں ملا کر اس چھید میں ڈال دیئے۔

مگر مدن کے تیر کا چھبایہ تو ضرور اس تختی پر اس جگہ پڑتا ہے۔ یہ بات تو صرف پندرہ ابریل کی خاص نہیں۔

ٹھیک ہے۔ مگر ہمیں ایک پائل آدمی کی باتوں کا بھی خیال کرنا چاہیے تھا۔ یہ آدمی کیونکہ پندرہ

اپریل کو کمرے سے نکلتا تھا۔ اس لئے اس کے وارث اسی دن گڑھے ہوئے خزانہ کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے تھے۔
یعنی تم جب چاہتے باغ میں جا کر سارے بیرے نکال سکتے تھے۔ اس میں شک ہی کیا ہے۔ مگر ان لوگوں کے خیالات کا بہت خیال تھا۔ اور سچ پوچھو تو میرا دل فیاضی کی طرف جھکا ہوا تھا۔ گو مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں ایسی غلطی کی۔

غلطی! غلطی کا کیا مطلب آفران اٹھارہ بیروں میں سے چھ تمہارے تھے۔

لوہن زور سے ہنس کر کہنے لگا۔ خوب! تم نے سنا نہیں؟ دوسرے ہی دن یہ لوگ کپتان جینٹ کے خلاف ہو گئے۔ اور سب سے پہلے جن لوگوں نے خلائی کی وہ دونوں ہم عمر عورتیں اور موٹا آدمی تھا۔ رہی وہ رسید وہ بھی ایک فضول چیز تھی۔ کپتان جینٹ کس طرح یہ گواہی دلا سکتا تھا۔ کہ میں فوج کا پنشن لینے والا کپتان ہوں۔ وہ سب صاف کہتے تھے۔ کہ اگر یہ آدمی اپنا حصہ لینا چاہے۔ تو عدالت میں مقدمہ کرے۔ اور لوٹی ڈی آر نمائٹ؟

صرف وہی ایک ایسی عورت تھی۔ جو ان لوگوں کو نفرت
کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ مگر اب بھی کیا ضرورت تھی۔ کہ
راہ جاتے سرور دمہول لیتی۔ اب وہ ایک امیر عورت تھی۔
اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔۔۔۔۔

”پھر؟“

پھر کیا میں بے بس تھا آفران سب میں سے چھوٹا پیرا
مجھے منظور کرنا پڑا۔ اس دنیا میں کسی پر رحم کرنے کا
یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر لوہن چھپ گیا۔ پھر ذرا رُک کر بولانیکی
۔۔۔۔۔ یہ بالکل تھوٹ اور بے فائدہ کو کسی کا احسان مند
نہیں۔ ہر ایک آدمی کو سچا حوصلہ دینے والا اس کا اپنا
آتما ہے۔ وہی اسے اپنا فرض ادا کرنے پر شائبش
دیتا ہے۔ اور بس۔

————— ❦ —————

حیا

مجھے تو اس نے تنگ کر رکھا ہے۔ حیا نہ معلوم کیوں میرے پیچھے لگی رہتی ہے۔ ہر وقت ہر گھڑی۔ جدھر جاتی ہوں میرے پیچھے۔ جہاں جاتی ہوں میرے ساتھ۔ جو کچھ بھی کرتی ہوں اس میں شامل۔ اگر لب واہ کرنا چاہتی ہوں تو ہر لگا دیتی ہے۔ اگر ان کے پاس جاتی ہوں تو ہر عضو لکارہ آنکھیں بند۔ زبان خاموش۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے مجھ سے کسی گزرے ہوئے جہنم کا برسے۔ نامعلوم اس میں کونسی کشش۔ کیسی بڑی اثر طاقت پوشیدہ ہے۔ کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی میں ایسے اپنے سے جدا نہیں کر سکتی۔ کمال ہے یہ حیا۔ خوب چھٹی۔ اسی کی وجہ سے کل ہر دیشور ناراض ہو گئے۔ جب ہا صرف یہ تھی کہ میں نے ایک ہا ر گوندھ کر ملازمہ کے ہاتھ بھیج دیا تھا۔ ساس اور نند کی شرم سے میں خود نہ جا سکی۔ یہی بات تھی جو انہیں ناگوار گندی اور ملازمہ سے کہہ دیا۔

میں اس نئے بہتر اور اچھا ہار بازار سے خرید سکتا ہوں۔ اسے واپس لے جاؤ۔۔۔ مجھے ضرورت نہیں!

ہار کے واپس آتے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ خفا ہو گئے ہیں۔ اور اسی نئے انہوں نے میری اس قدر بے عزتی کی ہے۔ وہ اسے بھی قابل قبول تصور کرتے۔ جب میں خود حاضر ہوتی اور اپنے ہاتھ سے ہار پہناتی۔

(۷)

آج میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا ہے۔ میں خود جانو گی اور اپنے ان حنائی ہاتھوں سے اپنے دیوتا کو ہار پہناؤ گی۔ وہ روٹھ گئے ہیں۔ انہیں مناؤں گی۔

میں باغیچہ میں گئی اور کافی گھنٹی جھاؤں میں بیٹھ کر ہار تیار کرنے لگی۔ وہ نصف سے کچھ زیادہ تیار ہو گیا تھا کہ آواز میرے کانوں میں پہنچی۔

ہو!۔۔۔ سہاگ و نئی!!

ابھی سب مجھے انہیں دو ناموں سے پکارتے تھے۔ کیونکہ ابھی چند ہی دن ہوئے میں میکے سے آئی ہوں۔ میں چونکی جلدی اور الجھن میں ادھر سے

ہی ہار میں گرہ دے دی - اتنے میں میری چھوٹی نند میرے
 قریب آئی اور شیریں لہجہ میں کہنے لگی -

”آپ یہاں چھپی ہیں ماں کافی دیر سے تمہیں بلا رہی
 ہیں“

میری ساس کام میں مصروف ہو گئیں - نند کھیں خوشی
 میں لگ گئی -

میں نے سوچا اس وقت جا کر ہار پہناؤں - وہ اوپر ہیں
 اور بالکل اکلے ہیں - اس وقت ہار بھی پہنا دوں گی اور
 سابقہ قصور کی معافی بھی مانگ لوں گی - وہ پاؤں کمرے
 باہر نکلی برآمدے میں پہنچی - ہر جانب نگاہ ڈالی کہ
 کوئی مجھے دیکھتا تو نہیں - ننگوان کی اپار کر پا ہوئی -
 ہر طرف سناٹا تھا - بالکل سناٹا - لپک کر جھٹ بیڑھی پر چڑھ
 گئی - ابھی دوہی بیڑھی چڑھی کہ یہی شیطان حیا نامعلوم
 کدھر سے آ موجود ہوئی - اور طلائی زنجیر بن کر پاؤں میں
 پڑھ گئی - پاؤں من من کا وزنی ہو گیا - دماغ میں
 سینکڑوں خیالات نے گھس کر لیا -

کیسے جاؤں؟ - کوئی دیکھ نہ لے - وہ مجھے اس
 وقت دیکھ کر کیا خیال کریں گے؟ -

ان سب خیالات کے زیر اثر میں ایک سیڑھی نیچے آرائی
دوبارہ پھر خیالات نے پلٹا کھایا۔

کیا کہیں گے؟ کچھ ہی نہیں — اتنی حیا بھی اچھی
نہیں!

بڑی ہمت کر کے حیا کی زنجیر پاؤں سے اتاری اور
اوپر چڑھ گئی۔ مگر پھر ٹھہری۔ پاؤں آگے جانے سے دوبارہ
انکار کر رہے تھے۔ پھر الجھن پیدا ہوئی۔

کیسے جاؤں؟ انہیں کیا کہوں گی؟ اگر وہ خود ہی دروازے
کی طرف منہ کئے بیٹھے ہو گئے تو ان کے پاس ہی کیسے پہنچوں گی؟

(س)

عجب حلال ہے مسلہ حل ہی نہیں ہوتا۔ اوپر جاؤ یا نیچے
کل تذبذب میں پڑی ہوں۔ کبھی جرات۔ طاقت۔ اور حوصلہ
یکجا ہو جاتے ہیں تو لگا اوپر اٹھ جاتی ہے اور کبھی تمام جوہر
دے دیتے ہیں۔ تو نظر نیچے کو جھک کر رہ جاتی ہے۔ میں بھی
اس شش و پنج میں تھی کہ دروازہ کھلا اور پاؤں کی آہٹ
سن کر میرا کلیجہ دھڑکنے لگا — اوپر سے وہی
خود آ رہے تھے۔

اب کیا کروں؟ — کدھر جاؤں؟ — چشم زدن میں بھاگ

بھی تو نہیں سکتی !
 وہ زینے پر آگئے - میں گھبرا اٹھی - اور کرتی بھی کیا -
 وہیں گھڑی سی بن کر زینے پر بیٹھ گئی - وہ میرے پاس آ
 کر رُک گئے -

میں نے محسوس کیا اگر ہو سکے تو اس دیوار میں
 سما جاؤں یا کسی جادو کے ذریعہ اثواب ہو جاؤں
 مگر کچھ بھی نہ سکی - تمام جسم پسینہ سے ترابور ہو گیا
 انہوں نے میری بیٹھ پر ہاتھ رکھا - تمام جسم لرز
 اٹھا -

یہاں کیا کر رہی ہو؟ - کیا وہاں کمرے میں آنے
 کی قسم اٹھا رکھی ہے؟

میں تمہاری راہ مدت سے دیکھ رہا ہوں - مگر تم ہو
 کہ بالکل پرواہ ہی نہیں ہے۔
 میں ان کے ان تمام سوالات پر بھی پتھر کے بت کی
 طرح خاموش بیٹھی تھی - زبان تک حرکت میں نہ
 آئی -

لب واد نہ ہوئے - ہاں سانس کی تیزی ضرور بڑھ
 گئی - میں خیال کیا کہ یہ بھی بند ہو جائے تو بہتر ہے۔

وہ بار بار سوال کرتے تھے۔ مگر میں لاکھ کوشش کے باوجود بھی جواب نہ دے سکتی تھی۔ زبان جیسے اکڑ چکی تھی۔ اور ہلنے کا نام تک نہ لیتی تھی۔ وہ میری اس سرد ہنری پر ناراض ہو کر واپس جانا چاہتے تھے۔ میری آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ اپنی اس حالت پر دلیری کو رحم آگیا۔ اُن کے منہ پھیرتے ہی میں نے ادھوراہار آنچل سے نکالا اور چاہا کہ اُن کے گلے میں ڈال دوں۔ مگر وہ بالکل چھوٹا تھا۔ میں یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح گلے میں پڑھ جائے۔ مگر وہ ٹوٹ گیا اور تمام کلیاں منتشر ہو گئیں۔ اور آٹھ دس کلیاں برآمدے میں بھی جا پڑیں۔

انہوں نے محبت سے میری طرف دیکھا۔ اور زیر لب مسکرا کر چلے گئے۔

”مگر اب میں نیچے کیسے جاؤں؟“
 ساس نند برآمدے میں تھیں۔ چھوٹی جھمٹانی کھل کھلا کر ہنس پڑی اور اُن سے کہہ گیا۔
 اور میں بیڑھیوں میں حیا کی وجہ سے گھسٹی جا رہی ہوں۔

نیچے اترنے کا راستہ تک نظر نہیں

آتا۔

مؤمن آپ کے پوچھا ہوں کہ جب آپ لکھیا کیا تھی کئی جہاں
نے یہ فقہ طبع فرمایا۔ آپ بڑی بے حیا ہیں
مگر مردہ عورت جس سے ہو گیا ہے کہیں ایسے قصہ تم طبع فرمائی
آپ کے سر سے ڈیوی

آپ کے سر سے ڈیوی
جس سے ہو گیا ہے کہیں ایسے قصہ
تم طبع فرمائی
آپ کے سر سے ڈیوی

تمام شد

اگر آپ
 جوٹی کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک
 خود غرض میونسپل کسٹروں کا بے نقاب فوٹو دیکھنا چاہتے ہیں تو
 آج ہی پہلی قسم کا نوکھا نرالانا اول

خود غرض میونسپل کسٹروں

پڑھیے۔ لطف اٹھائیے۔ اور اپنی معلومات میں اضافہ کیجئے۔
 ناول ہذا کو سپرد قلم کرنے میں شمالی مندر کے مشہور ناول نویس بلیو جینرڈ کیانی نے وہ
 وہ شوخی قلم دکھائی ہے۔ کہ بے ساختہ زبان سے عین عیش نکلنے لگتا ہے۔ ایک ناول شروع کرو۔
 سارا پڑھے بغیر تھوڑے کول نہیں چاہتا۔ ناول کیا ہے؟ بیٹھا خوبوں۔ انتہائی دلچسپیوں اور
 کارآمد معلومات کا مخزن ہے۔ اس ناول میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے پڑھنا شروع کرنے کی دیر آج کا ایسے
 محسوس ہو گا جیسے ہم کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔ خود غرض میونسپل کسٹروں کے ہتھکنڈے، دوسرے کے
 ناکی دوہائی دے دیکر اپنا اٹویدھا کرنے کے نرائے ڈھنگ انسانیت سے گری ہوئی فریب کاریاں
 عرصہ تک تمام واقعات کی آنکھوں کے سامنے گھومتے چلے جائیں گے زبان ملیں بچوں بوڑھوں کے ملکی۔
 مجلسی اور تعلیمی ترقی کے لحاظ سے یکساں مفید کتاب عمدہ چھپائی صاف، کاغذ واجبی

بڑھیا قیمت صرف ۱۲ محمولہ ڈاک بزمہ فریڈلر
 ملنے کا پتہ: بھارت پوسٹک بھندار کٹر ایلو والیام لکسر

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۲۴ Accession No. ۱۳۶۸۶

Author ڈ - ٹ
Title دیباچہ کاغذی ہے

This book should be returned on or before the date last marked below.

